قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فہو منہم

الحمد للہ کہ شرح حدیث مذکور مسمی بہ

جس میں مسئلہ تشبہ بالکفار کی اہمیت، اس کی شرعی و عقلی حیثیت، اس کے منشا و ماخذ، اس کے فقہی درجات، پھر اس کے قدرتی نتائج پر عقل سلیم اور نقل صحیح سے روشنی ڈالی گئی ہے اور منکروں کے تمام اصولی اور فروعی شبہات کا استیصال کیا گیا ہے۔

مصنفہ

جوان صالح عالم باعمل مولانا الحافظ الحاج القاری محمد طیب سلمہ اللہ نائب مہتمم دار العلوم دیوبند ابن حضرت مولانا الحافظ الحاج محمد احمد رحمہ اللہ مہتمم دار العلوم و نبیرہ حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا محمد قاسم بانی دار العلوم دیوبند قدس اللہ سرہ

(باہتمام)

مولوی قاری محمد طاہر صاحب

مطبع قاسمی دیوبند طبع شد ۱۳۴۸ھ

فہرست مضامین التشبّہ فی الاسلام

تقریظ

از حضرت سیدی و مولائی حکیم الامۃ مولانا الحافظ الحاج الشاہ محمد اشرف علی صاحب

تھانوی دامت برکاتہم

بعد الحمد والصلوٰۃ - اس احقر نے رسالۂ ہذا کو حرفاً حرفاً دیکھا، ایک ایک حرف کی ساتھ قلب میں سرور اور آنکھوں میں نور بڑھتا جاتا تھا، تشبیہ کا مسئلہ ایسا مکمل و مفصل و مدلل لکھا ہوا میں نے نہیں دیکھا، جن لطائف تک ذہن جانے کا احتمال تک نہ تھا وہ منصۂ ظہور پر آگئے - بعید سے بعید شبہات تک کا قلع قمع کر دیا گیا - اللہ تعالیٰ رسالہ کو نافع و مقبول فرما کر اس کلم طیب کے عموم میں داخل فرمائے جس کی شان میں -

الیہ یصعد الکلم الطیب -	اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے -

وارد ہے اور صاحب رسالہ کو اس جماعت میں داخل فرمائے جس کی شان میں -

ھُدوا الی الطیب من القول وھُدوا	اُن کو کلمۂ طیب کی ہدایت ہو گئی تھی اور اُن کو
الی صراط الحمید -	اُسکے راستہ کی ہدایت ہو گئی تھی جو لائق حمد ہے

وارد ہے -

حررہ الاحقر اشرف علی

[illegible] جمادی الاخری [illegible]

تقریظ از حضرت فخر الہند مولانا الحاج الشیخ حبیب الرحمٰن العثمانی دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفٰی وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی - اما بعد مسئلہ تشبہ اسلام کے ان اہم مسائل میں سے ہے جس پر اسکے اکثر اصولی و فروعی احکام کی بنا قائم ہے اگر اس مسئلہ کو تسلیم نہ کیا جائے اور اسکو اصل اصول نہ مانا جائے تو اسلام کے بہت سے احکام قابل تسلیم نہ رہینگے یہی وجہ ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو اسلامی احکام کے تقید سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اُن کا سب سے پہلا حملہ مسئلہ تشبہ پر ہوتا ہے اور وہ اپنی تمام تر کوشش اسکو مٹانے میں صرف کرتے ہیں لیکن باوجود اس مسئلہ کے اسقدر اہم اور مہتم بالشان ہونیکے کوئی کتاب اب تک ایسی نہ لکھی گئی تھی جس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو واضح کر کے [illegible] مستحکم و مرتب قائم کر دیا جاتا

اور حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا الحاج قبلہ ارباب رشد وہدایت آیۃ من آیات اللہ العظیم وحجۃ اللہ تعالیٰ علی العالمین محمد قاسم النانوتوی قدس اللہ سرہ کے پوتے مولوی قاری حافظ الحاج محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے اسم گرامی پر نکلا جس جماعۃ حقہ کے اصاغر ایسے ہیں اسکے اکابر کیسے الشجرۃ تنبئ عن الثمرۃ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی عمر وصحت علم وعمل اخلاق حسنہ اور فیوض ظاہریہ وباطنیہ مراتب مناسبہ میں روز بروز ترقی عطا فرمائے اور ان کو حضرت قاسم العلوم والخیرات قدس سرہ کا صحیح جانشین بنادے اور اس کتاب کو مقبول خاص وعام بنا کر اہل اسلام کو اس سے مستفیض فرمائے آمین۔ مسلمان اور بالخصوص ناظرین حضرات اسکو بار بار پڑھکر مسلمانوں کو اسکے مضامین عالیہ حقہ سے مستفیض فرما کر عزیز مصنف اور دارالعلوم دیوبند کو دعائے خیر میں یاد فرمائیں۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کتاب کے دوسرے حصے اور مصنف موصوف کے دوسرے مفید رسائل کے فیض سے بھی مسلمانوں کو جلد متمتع فرمائے آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ ونور عرشہ وسید انبیاءہ وسلم وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

تقریظ از حضرت مولانا الحاج السید اصغر حسین صاحب دامت برکاتہم محدث دارالعلوم

حامداً ومصلیاً۔ احقر نے اپنے عزیز گرامی قدر مولانا محمد طیب صاحب کا علمی رسالہ نہایت غور سے پڑھا طبیعت کو نہایت فرحت حاصل ہوئی اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ مولانا کو ایسے فیوض علمیہ سے مالا مال فرمایا اور نشر واشاعت کی توفیق دیکر اہل علم کے لیے حظ وافر اور دیگر حضرات کے لئے سامان ہدایت میسر فرمایا۔

کتبہ الفقیر اصغر حسین عفا اللہ عنہ

تقریظ از حضرت مولانا الحافظ محمد اعزاز علی صاحب دامت برکاتہم مدرس دارالعلوم دیوبند

صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ امابعد زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ بعض دوست نما دشمن یا نادان دوست یورپ کے تمدن سے متاثر ہو کر اسلام اور غیر اسلام کی اس درمیانی خلیج کو پاٹنے لگے تھے جو بہت زیادہ وسعت کے ساتھ دنیا (۱) میں حائل تھی اور جس کے ذریعہ سے تھوڑی سی توجہ کے بعد انسان اسلام اور غیر اسلام میں امتیاز کر سکتا تھا۔

انوار رحمت سے بھرے ہوئے وجود عالم اس مقدس ذات کی قبر کو جس کے مساعی نے آج تک اکناف عالم کو انوار علوم دینیہ سے منور رکھا ہے۔ اور جسکو ہم آج حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہ کہا کرتے ہیں۔

اس مقدس ہستی نے دنیا میں رہکر اگر ایک طرف غیر مسلموں کے شکوک کا ازالہ کیا تو دوسری طرف ان اندرونی اعدا کے عقائد فاسدہ اور اعمال منکرہ کی تنقیح بھی کی۔ اس مخلصانہ ادر حسبۃً لوجہ تعالیٰ شانہٗ مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ منکرات کی یہ بڑھتی ہوئی رَو یکایک رک گئی اور یہ سیلاب عظیم خدائی براہین کے سامنے سربسجود ہونے لگا۔ اس موجودہ دور میں انھیں عقائد فاسدہ اور اعمال منکرہ کی اشاعت مقدم الذکر اصحاب کی روحانی اولاد نے پھر شروع کی اور وہی اسلحہ اسلام کے استیصال کے لئے استعمال کئے جو ان کو اپنے روحانی مورثوں سے ترکہ میں ملے تھے۔

قادر مطلق مدارج دارین بلند کرے جناب مولانا مولوی قاری محمد طیب صاحب کے جنھوں نے اس فرض کو باحسن وجوہ اس رسالہ کی صورت میں ادا کیا جو اُنپر حضرت ممدوح الصدر کے نبیرہ ہونے کی حیثیت سے دفاع عن الاسلام کے متعلق عائد ہوتا تھا اور اسی لئے میرا دل چاہتا تھا کہ مورث اور وارث کی دونوں جماعتوں کی مدح میں عرب کے شاعر کا یہ شعر پڑھ دوں۔

فکلهم اتی مأتی ابیهم	فکل فعال کلهم عجاب

بلا شبہ تشبہ بغیر المسلم کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے کہ جسپر اسلامی اصول و فروع کا بہت زیادہ مدار ہے اور اسی واسطے مخالفین اسلام نے اسکی اہمیت کو کم کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے اور علما نے اسپر روشنی ڈالی ہے۔ موجودہ حالت میں کہ یورپ کی طمع سازیاں زیادہ سرعت کے ساتھ قدم آگے بڑھا رہی ہیں، ضرورت تھی کہ دلچسپ انداز میں اسلام کے چہرہ سے اس گرد و غبار کو دور کر دیا جائے۔ الحمد للہ کہ یہ ضرورت اس تصنیف نے پوری کر دی۔

میں نے اس رسالہ کا بہت سا حصہ مختلف مقامات سے متفرق اوقات میں دیکھا اور سچ یہ ہے کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کہ ہیں کن الفاظ سے اس رسالہ کی مدح سرائی کروں۔ معمولی الفاظ بجائے مدح کے ذم کی صورت اختیار کریں گے اور اگر پوری تعریف کروں تو یہ دشواری ہوگی کہ لوگ کہینگے کہ مقرظ متملق ہے اور میں خیال کروں گا کہ ہیں اب بھی واقعیت تک نہ پہونچ سکا۔ ؎

الیس عجیبا ان وصفك معجز	وان لسانی فی معالیك تظلم

اس لئے اس کا ارادہ ہی ترک کرتا ہوں اور مصنف کے لئے دعا کرتا ہوں کہ خدایا! اس علمی نونہال کو علماً و عملاً اپنے جد امجد کے قدم بقدم رکھ۔ اور تشنگان علم کو اس جدول علمی سے سیراب فرما۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد اعزاز علی غفرلہٗ مدرس دار العلوم دیوبند

۲۷ر جمادی الثانیہ [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

وجہ تصنیف اور مصنف کی چند ضروری گذارشین

دنیا میں قوۃ و شوکۃ جس چیز کا ساتھ دیتی ہے وہ قدرتی طور پر عالم کیلیے نظر فریب اور دلپذیر بنجاتی ہے۔ کسی خوبی اور کمال ہی پر منحصر نہیں، بڑے سے بدتر امور اور فواحش و منکرات بھی جب شوکۃ و قوۃ کی حمایت میں بسیط ارض پر نمایاں ہوتے ہیں تو عامۃ الناس کی توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور اسی کے بالمقابل کس مپرسی، ذلت اور مغلوبیت و ناتوانی وہ مہلکۂ عظیمہ ہے کہ بھلی سے بھلی چیز کو بھی عام طبائع کے لئے حقیر اور ناقابل التفات بنا دیتی ہے۔

اسلامی تمدن جسکی بنیاد سادگی۔ زہد و قناعت۔ تدیّن و خدا پرستی اور سنن نبوۃ پر قائم تھی جبکہ ہماری سیہ کاریوں کی بدولت شوکۃ و قوۃ نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تو شوکۃ پرست طبیعتوں نے بھی اُس سے منھ موڑ لیا اور دنیا اسکے ہو نہ آنے لگی، اُسمیں ہزاروں معائب پیدا ہوگئے اور پرایوں سے زیادہ اپنوں ہی کیلیے وہ ناقابل التفات اور قابل گذاشتنی بن گیا۔ اور ٹھیک اس کے بالمقابل وہ انگریزی تمدن جسکا منشا یقیناً کوئی طریق نبوۃ اور خُلق ربانی نہیں بلکہ اسکی بنیاد ہی تلذّذ و تعیّش اور نفس پروری و تن آسانی پر قائم کی گئی ہے جبکہ حکمرانی اور شوکۃ کے زیر سایہ تربیت پاکر پروان چڑھا تو آج اُس نے اپنے اندر کتنی رعنائی و دلربائی پیدا کر لی، اسکا نظر فریب شباب کس درجہ جاذب قلوب بنگیا اور اُس نے سرزمین ہند کے نونہالوں میں سے کسقدر اپنے ایسے عاشق پیدا کر لیے جو اُسپر جان و ایمان نثار کردیتے ہیں بھی کوئی دریغ نہیں رکھتے۔ وہ اسکی ہر بُری سے بُری خصلۃ اور اُسکے شنیع سے شنیع رویہ کا محض اسلئے پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس کی ساتھ غلبہ و تسلّط کی نمود ہے۔

قوۃ و ضعف کے اس ادل بدل نے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا اور تہذیب یورپ اور

تمدن ایشیا کی اس ہولناک کشتی کا انجام یہ نکلا کہ مسلمانوں کے قلوب پر سپیدۂ مشرق کی روشنی پھیلنے کے بجائے مغرب کی تاریکی چھانے لگی اور رفتہ رفتہ انہوں نے تمدن کی دہلیز پر تزئین کی دولت نثار کرنی شروع کردی۔ یہانتک کہ آخرکار آج اُن کے عمائد میں سے اسلاف کی سی روشیں یکسر گم ہوگئیں۔ نہ مسلمانہ اوضاع و اطوار رہے۔ نہ مومنانہ عادات و خصائل نہ اصحاب تقدس کی سی نورانی پیشانیاں ہی رہیں۔ نہ اصحاب تقویٰ کے سے چہرے اور خد و خال۔ نہ صلحاء کے سے ملبوسات رہے نہ ربانیوں کے سے مالوفات۔ بلکہ انکی جگہ متفرنجانہ افکار و اعمال۔ خود پرستانہ زی و ہیئت رعونت آمیز رفتار و گفتار کافرانہ ملبوس اور منکرانہ مرغوبات نے سنبھال لی۔ گویا تیرہ صدی بعد قوم کے نزدیک تمام ترقیات و سعادات کا معیار بجائے اسوہ ہائے نبوۃ کے اُن گم کردہ راہ اقوام کی مساعی ٹھہر گئیں جو نبوۃ کے ہاتھوں بچھاڑی ہوئی قومیں تھیں۔ اور اتباع و پیروی پھر مماثلت و مشابہت کے وہ تمام مدارج جو شیفتگان نبوۃ اور حاملان رسالت کے ساتھ قائم ہوتے آج دنیا کی مادہ پرست اقوام کے ساتھ قائم ہوگئے۔

پھر اتباع سنن اقوام یا فتنۂ تشبہ کی ریشہ دوانیاں صرف عمل ہی تک محدود نہ رہیں بلکہ بدعملی کی مشق نے علم کو بھی ماؤف کردیا۔ قلوب سے فرقانی قوۃ اور تمیزی طاقت اُٹھ گئی۔ اور وہ چیزیں جو کل تک مکروہ سمجھ کر بچائی جاتی تھیں آج مباح سمجھ کر زیر عمل لائی جا رہی ہیں۔ ملک کی کوششیں اور قوم کی ہمتیں تشبہ بالاقوام اور تشبہ بالنصاریٰ کو نہ صرف روا بلکہ مستحسن باور کرانے میں مصروف ہیں۔ اس نامعقول مقصد کی تکمیل کیلئے کھلی ہوئی ڈھٹائی اور بیحیائی کیساتھ دنیا میں اعداء اللہ، اعداء الرسول، اعداء العلماء کے اسماء کی انجمنیں قائم کیجا رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل میں بحثیں اٹھائی جا رہی ہیں کہ موجودہ تمدن کے تمام اختراعات و محدثات خواہ وہ لباس سے تعلق رکھتی ہوں یا تجمل و تزئین سے اور خواہ وہ رہائشی امور کے متعلق ہوں یا نمائشی چیزوں کی یہی نہیں کہ وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ عین سنن اسلام کے ماتحت اور مقاصد دین کے موافق ہیں۔ غرض اسلام کے نام سے ملت کی ایک ایسی تشکیل کیجا رہی ہے جس سے اسلام کی اصلی شکل و صورت مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر کچھ مدت اسی طرح دین پر یہ سفاکانہ مشق جاری رہی تو وہ دن دور نہیں کہ اسلام کے حقیقی خد و خال دنیا کی نگاہوں سے چھپ جائیں اور قلوب پر اسلامی حقائق بالکلیہ مخفی ہوجائیں۔ اور اسلامی معاشرت کا نہ کوئی خاکہ باقی رہے نہ کوئی پتہ نشان۔

ایسے فتنہ خیز اور دور التباس و الحاد میں اس عاجز کے دل میں محض دردمندانہ اور خیرخواہانہ طریق پر جو

داعیہ پیدا ہوا کہ اپنی بساط اور مقدور کے موافق مسئلہ تشبہ پر قلم اٹھایا جائے اور اسکی عقلی و شرعی حیثیت پیش کر کے
مخلوق کو پھر ایک دفعہ اُسی مرکز حقیقت کیطرف متوجہ کیا جائے جو دین خالص اور صراط انبیا تھا اور لوگوں نے اس سے مختلف
ٹیڑھے بینکے خطوط کھینچکر نئی نئی پگڈنڈیاں نکال لیں اور چل کھڑے ہوئے یہانتک کہ مرکز سے دور جا پڑے پس حق تعالے
کی توفیق بخشی پر بھروسہ کر کے قلم اُٹھایا اور اس تحریر کی بنیاد ڈالی۔

لیکن ایک طرف تو مسئلہ بذاتہ اہم اور اپنے اُصول و فروع کی ہمہ گیری کے سبب بہت کچھ پھیلاؤ رکھتا تھا پھر ایک عرصہ سے جدید
تربیت یافتہ دماغوں کی مختلف شبہات کی آماجگاہ بنے رہنے کے بدولت اُسمیں بحث و تمحیص کے بہت سے پہلو پیدا ہو گئے تھے اور اُدھر یہ نالائق
یکسوئی کیساتھ طالب علمانہ رنگ کو مقصد زندگی قرار دی لینے کے سبب تصنیف و تالیف کے کوچہ سے قطعاً نابلد تھا پھر قلم کمیابی کی [illegible]
بے بضاعتی اور اوپر سے کسل طبعی وغیرہ امور نے اسکی مہلت نہ دی کہ میں مستقلاً اور یقیناً اس اہم مقصد کو انجام دے سکوں اسلئے
انہی اعذار کے ہجوم میں جسقدر وقت ملا اور توفیق الٰہی دستگیری کرتی تھی قلم برداشتہ ان مسائل کو جو مختلف کتابوں میں نظر سے
گذرتے اور ان مباحث کو جو غور و فکر کے بعد ذہن نارسا میں خطور کرتے قلمبند کر لیتا تھا۔ یہانتک کہ الحمد للہ اس ذخیرہ سے
مسئلہ تشبہ کے متعلق دو ضخیم جلدیں مرتب ہو گئیں جنمیں سے پہلی جلد جو تشبہ کی اصولی اور کلی مباحث پر مشتمل ہے پیش کرنیکی جرات
کر رہا ہوں۔ اور دوسری جلد جو فقہی الابواب کی ترتیب سے تشبہ کی فروعی جزئیات کی جامع ہے آئندہ پیش کرنیکی عزت حاصل کرونگا انشاء اللہ
جمع کیگئی ہیں وہ مختلف کتابوں (حسن السیری احکام من تشبہ بالغیر للدمیاطی۔ حجۃ اللہ البالغہ للشاہ ولی اللہ۔ اقتضاء الصراط
المستقیم لابن تیمیہ کشف الکربہ عن احوال اہل الغربۃ لابن رجب حنبلی بعض تصانیف حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات مولانا
محمد قاسم قدس اللہ سرہ) میں منتشر تھے اور اگر اقتضاء الصراط المستقیم جسمیں اسی موضوع پر استیعاب کی ہوئی ہے اسمیں یہ مسائل بکھرے
ہوئے موتیوں کی طرح ہاتھ لگے اور انمیں اور زیادہ انتشار ابن تیمیہ کے اس دریا کی طرح اُمنڈ آنیوالے علم نے پیدا کر دیا ہے جسکا طوفان خیز
سیلاب صرف ایک ہی دھار پر نہیں بہتا بلکہ ہمیشہ مختلف فنون اور متشتت علوم کی جدولوں اور نہروں میں ہو کر بہا کرتا ہے تاہم میں نے
ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک ایسی ترتیب سے جوڑنیکی کوشش کی ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دینے لگیں اور ایک
پیاسے کیلئے نہایت سہل الوصول اور ظلمات میں آب حیات ثابت ہوں۔

	گر ما نرسیدیم تو شاید برسی	دادیم ترا ز گنج مقصود نشان	

جو لوگ حقیقت کی تلاش میں سرگردان ہیں اُنسے درخواست ہے کہ جہاں وہ بہت سے دستر خوانوں کی الوان نعمت سے خط

اٹھاتے ہیں وہ کم از کم تبدیلِ مذاق ہی کی نیت سے اس سادہ اور بے تکلف مائدہ کے گرد بھی جمع ہوں لیکن نہ سرسری بلکہ تدبر و تفکر اور تجسس و تلاش کے ہاتھ سے اسکی شیریں انجام نعمتیں چنیں تاکہ وہ غامض حقیقتیں اور بالغ حکمتیں جو ہمیشہ کمال توجہ ہی سے حاصل ہوئی ہیں ان کے لئے سیری اور تسلی کا باعث بنیں ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اوراق پریشان قوم کی حالت میں جلد از جلد کوئی انقلاب پیدا کر دینگے اور ایسا ہونا فطرۃ کے بھی خلاف ہے بالخصوص جبکہ قوم کو ایک ایسی معتدل راہ کیطرف بلایا جائے جس پر چلانے میں انبیاء علیہم السلام کو بھی بیش از بیش دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تاہم یہ ایک تخم سعادۃ ہے جو قلوب کی زمین میں بکھیرا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ بار آور ہو، خدا کرے کہ خیالات کی دنیا ادھر پلٹ جائے اور قبولِ عمل کے آبِ صافی سے اسکو سینچے۔

ہاں یہ بھی باصرۂ اہلِ نظر پر پوشیدہ نہ رہنا چاہئے کہ ان اوراق کا مقصد قلوب والے کو کسی تنگی اور ضیق میں مبتلا کرنا یا اٹھتے ہوئے جذبات کو پامال کرنا نہیں بلکہ اسلامی قوم کو من حیث القوم وقار و خودداری، مذہبی حمیت و غیرت اور تحفظ خود اختیاری کی دعوت دینا ہے تاکہ قوم میں اپنے حقیقی شعائر و خصائص کو زندہ رکھنے کا ولولہ پیدا ہو جائے اور اسطرح قومی وجود کی عمارت منہدم نہ ہونے پائے۔ کیونکہ قومی زندگی کی بنیادیں اسوقت تک استوار نہیں ہو سکتیں جب تک کہ اسی قوم کی خصائص پر ان کا سنگ بنیاد نصب کیا جائے جو قوم اپنا مخصوص وجود نہیں رکھتی وہ یقیناً خود اپنی بنیاد پر قائم نہیں ہے اور اسلئے نہ وہ بقاء و استحکام کی دولت سے مالا مال ہے نہ تحقیر و تشنیع اغیار سے مامون۔ اور ضرور ہے کہ ہر ایک دانشمند ایسی قوم کو غیرت و حمیت کا قاتل اور مذہب و ملت کا جانی دشمن تصور کرے گا۔" آخر میں اس درخواست پر مقدمہ کو ختم کرتا ہوں کہ جو فرد بھی ان مسائل پر رائے زنی کرے اور حقیقتاً علم و اخلاص کے ساتھ تنقید کیلئے قلم اٹھائے تو وہ صرف کسی ایک آدھ ہی مسئلہ کو دیکھکر اسی پر اپنے خیالات کی آماجگاہ نہ بنائے۔ بلکہ کتاب کے تمام مباحث پر ایک حاوی نظر ڈالکر جو مجموعی مقصد اس کے سامنے آئے۔ اور بحیثیت مجموعی اسلام کی جو غرض ان مسائل سے مترشح ہو اسکو زیر نظر رکھکر اپنے خیالات کو حرکت دے۔ ورنہ بسا اوقات ایک مسئلہ کو دیکھکر یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ اسمیں بیجا تشدد اور زائد از ضرورت تنگی و سخت گیری سے کام لیا گیا ہے لیکن جبکہ اس مسئلہ کی تمام اخوات کو دیکھکر مجموعی غرض اور تحتانی غایت واضح ہوتی ہے تو پھر وہ سخت گیری جسکو ایک ظاہر پرست نگاہ تنگی دیکھتی ہے۔ حکمت خیز اصول نظر آنے لگتی ہے۔ اور پھر اسکو تحفظ حدود کہنے لگتے ہیں۔

اعتذار — ان اوراق کی ترتیب ایک سراسر خطاکار، پُر از عیوب، قلیل العلم اور کم سواد طالب علم کی قلم سائی کا نتیجہ ہے جسمیں بہت ممکن ہے کہ زلتوں اور لغزشوں کا ایک ذخیرہ ملے۔ اسلئے کرام ناس سے التجا ہے کہ مسئلہ کا جو پہلو تشنہ رہ گیا ہو یا جس پہلو میں فروگذاشت ہوئی ہو اس سے اس ہیچمدان کو آگاہ کر دیں اور چشم پوشی و تسامح سے کام لیں۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر		میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

معترف تقصیر مستدعی دعا

محمد طیب عفا اللہ عنہ و عن والدیہ

(دار العلوم دیوبند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

این رہ منزل قدس است بیندیش و بیا	میل ازیں راہ خطا باشد ہمین تا نکنی

الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وعلی الہ واصحابہ وازواجہ وذریاتہ واتباعہ اجمعین ۔ امابعد

انقلاب اُمم

دنیا میں سیکڑوں قانون بنے اور بگڑے ۔ ہزاروں آئین مرتب ہوئے اور پھر مٹ گئے ۔ مگر وہ ایک قانون جس نے ابتداے آفرینش سے آجتک کبھی تغیر وانقلاب قبول نکیا وہ خود قانون انقلاب ہے۔

اس انقلاب وتغیر کی دسترس سے کائنات کا کوئی جوہر وعرض اور کیف وکم امن نہیں پاسکا ۔ زمانہ اور زمانیات مکان اور مکانیات کو کبھی اس قانون نے مہلت نہ دی کہ وہ ابدقرار یا کسی ایک حال پر قائم رہ سکیں ۔ ارضیات کو دیکھو تو تعمیر وتخریب شکست وریخت بدل سدل اور فنا وبقا نے پھر سماویات کو لو تو ادوار واطوار، ایاب وذہاب ۔ گردش ودوران اور لوٹ پھیر کی متضاد کیفیات نے ان کے ہر ہر ذرہ کو اپنی زنجیروں سے جکڑ دیا ہے ۔

وہ اشرف ترین نوع (انسان) جس نے تمام کائنات ارضی وسماوی پر فضیلت کا دعوی کیا ہے اس کا بھی کوئی فرد اور کوئی مجموعہ پھر اس کی ہر ہر حالت انفرادی ہو یا اجتماعی ان دھری انقلابات عروج

و نزول اور رفعت و پستی سے مامون نہ رہ سکی۔

کبھی یہ ظلوم و جہول عزم و ہمت لیکر اوج سعادت کی طرف اٹھتا ہے تو طائران قدس بھی اسکی پرواز سے نیچے ہی دھرے رہجاتے ہیں اور کبھی یہی پاکباز انسان پستی و دنائت کے سبب حضیض ذلت کیطرف گرتا ہے تو عالم کی ہر ذلیل سے ذلیل چیز اس سے اچھی اور برتر معلوم ہونے لگتی ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین ۔	ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے پھر ہم اسکو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم	گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

غرض اس اشرف الکائنات کے سکون و قرار کا سر بھی تغیر و انقلاب کے بارے کبھی ہلکا نہ ہو سکا۔

زمانہ کی تلون مزاجیاں اور تغیر پذیر رفتاریں ہمیشہ ایسے انقلابات پیش کرتی رہی ہیں اور کائنات عالم کا کرّہ ہمیشہ گیند کی طرح اس کے چوگان تلون سے لڑکتا رہا ہے۔ اس نے کتنے ہی راعیوں کو جنہوں نے برسوں خدا کی مخلوق پر جبروت سے حکمرانی کی ایک ذلیل رعیت کی حیثیت میں پیش کیا اور کتنے ہی سروں کو جن پر عزت کے تاج رکھے گئے۔ ذلت و خواری کی ٹھوکروں کے قابل بنا دیا۔

زمانہ کی روشن مثالی جب اپنا چہرہ بے نقاب کرتی ہے تو سگ اصحاب کہف عزت و شرف میں بنی آدم کے دوش بدوش نظر آنے لگتا ہے۔ اور زمانہ ہی کی تصویر جب اپنا تاریک اور بدنما پہلو سامنے کرتی ہے تو ایک جلیل القدر اور الوالعزم پیغمبر (نوح ؑ) کا بیٹا اہل نار کے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ اور خاندان نبوۃ کو داغدار بنا دیتا ہے۔

پسر نوح با بداں بنشست سگ اصحاب کہف روزے چند	خاندان نبوتش گم شد پئے نیکاں گرفت مردم شد

پھر نہ صرف اشخاص بلکہ دنیا کی اگلی اور پچھلی تمام اقوام اسی قانون تغیر و انقلاب اور ضابطہ حدوث و تجدد کے سامنے سر خم کئے ہوئے گذریں اور گذرتی رہینگی۔ کتنی ہی اولوالعزم قومیں تاج و تخت کے جبروت کے ساتھ افق عالم پر چمکیں اور دنیا کی نگاہوں کو انہوں نے اپنے سطوت و جلال سے خیرہ

کر دیا لیکن پھر انہی سطوت واقتدار کے مالکوں کو قانون انقلاب کے ہاتھوں نے کائنات کے دنگل میں اس طرح پچھاڑ دیا کہ پھر وہ قومیں کبھی نہ ابھر سکیں۔

وہ قوم جس نے من اشد منا قوۃ کا نعرہ بلند کیا۔ وہ قومیں جنھوں نے اپنی فوق العادۃ صناعیوں سے پہاڑوں کو موم کی طرح تراشا اور ان میں بیوت و مساکن بنائے وعمروھا اکثر مما عمروھا اور وہ قومیں جن کی بے مثال دماغی اور علمی جولانیوں کی تاریخ آجتک دنیا کو حیرت واستعجاب کی دعوت دے رہی ہے یعنی عاد۔ ثمود۔ اصحاب مدین اور کلدانی قومیں دنیا میں زبردست اقتدار کی ساتھ آئیں۔ ترقی اور نئے نئے ایجادات کی ساتھ آئیں۔ لیکن جبکہ ان کے وسیع طاقت کے گھمنڈ نے متاع دنیا کی بغض پرور طلب حظوظ نفسانی کی ہوسناک مانگ اور استمتاع خلاق کی بستیانہ آرزو پر انھیں اندھا کر کے مست غرور و پندار کر دیا تو سنت جاریہ کے موافق قدرۃ کا وہی انقلابی پنجہ نمودار ہوا اور اسنے ان کے عروج و اقبال کو ایسا حرف غلط کی طرح مٹایا کہ آج سطح زمین پر کوئی نقش قدم بھی انکا پتہ دینے والا نہیں۔

فھل تری لھم من باقیۃ ؟ کیا تم کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے۔ ؟

ھل تحس منھم من احد او تسمع لھم رکزا؟ کیا آپ انہیں سے کسیکو دیکھتے ہیں؟ یا انکی کوئی آہستہ آواز سنتے ہیں؟۔

پس اس کار دانسرائے انقلاب میں تمکین و قرار کے کتنے ہی مسافر یکے بعد دیگرے آئے اور اپنی اپنی باری سے تخت اقبال پر متمکن ہوئے۔ پھر آخر کار انقلاب کی آویزش سے اپنی اجل معلوم پوری کی اور دوسروں کے لئے جگہ خالی کر گئے۔

یکے ہمی رود دیگرے ہمی آید

وتلک الایام نداولھا بین الناس = اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان میں اولتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔

اسلامی قوم کا انقلاب صحۃ و مرض

آج بھی اس قانون انقلاب کا تماشا دیکھو۔ اور دیدۂ اعتبار سے دیکھو کہ اس جلیل القدر اور خیر الامم امۃ (اسلامی امت) پر ایک وہ زمانہ بھی آچکا ہے جبکہ اس کا ایک ایک فرد سعادت و برکات کی زندہ تصویر اور خودداری و وقار کی زندہ یادگار تھا۔ دنیا میں ان کی مثالیں ہاتھ نہ لگتی تھیں اسلئے کہ وہ

اپنی مثال خود ہی تھی۔ قومیں ان سے لرزتی تھیں تاج و تخت کے مالک ان سے تھراتے تھے اور ان کے نام سے بڑے بڑے مغرور دماغ ڈھیلے پڑجاتے تھے اسلئے کہ قوۃ و شوکتہ ان کے قدموں میں تھی اقبال ان کے آگے آگے تھا اور وہ ناکامی و تنزل کو پس پشت پھینکتے ہوئے فوز و فلاح کیطرف بڑھتے چلے جارہے تھے لیکن آہ کہ آج اسی درخشاں قوم کے افراد ہم جیسے تاریک دل ناکام تمنا اور محروم اقبال انسان ہیں۔ وہ انسان کہ انسانیۃ ان سے شرماتی ہے اور مکارم اخلاق کو ان سے بٹہ لگ رہا ہے۔ ع

ابتدا وہ تھی انتہا یہ ہے

ماضی کے سامنے مستقبل کو شرمانا پڑرہا ہے، آہ کہ جو بزم ہمیشہ بادہ بجام رہی ہے آج آتش بجام نظر آتی ہے

در مجلسے کہ یاراں شرب مدام کردند
چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

امت اسلام کے سر پر جبکہ ایک مبارک عہد نے اپنا ظل ہمایونی ڈالا تو وہ اتنی خوددار اور باجبروت ہوئی کہ اس کی حیرت انگیز طاقت نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ عالم کی حکمرانیوں کے نقشے بدلدیئے۔ اور دنیا کی کایا پلٹ دی۔ اور اسی قوم پر جبکہ اس نامبارک قرن نے اپنا سایہ ڈالا تو وہ اتنی بے وزن اور محروم وقار ہوگئی کہ آج دنیا نے ملکر اس کا نقشہ بدلدیا اور اقوام عالم نے خود اسکی کایا پلٹ دی۔

بیدہ المیزان یرفع بہ اقواما و یضع بہ آخرین
اسی کے ہاتھ میں میزان ہے کبھی قوم کو اس قرآن کے ذریعہ بلند فرمادیتا ہے اور کسی کو پست

در بزم عیش یک دو قدح درکش و برو
یعنی طمع مدار وصال دوام را

اس زبردست قوم کا ماضی و حال ہمارے سامنے ہیں ایک طرف تو وہ قدیم سکون و طمانیت کی شگفتہ فضائیں و سعادت کی سبک بلندیاں اور جاہ و جلال کے سب ارفع مناظر ہمارے سامنے ہیں جنکو اسکے ماضی قریب ہی میں اس قوم کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور دوسری طرف ہلاکتوں کے لگاتار طوفان۔ تباہی کے پیاپے جھکولے۔ اور اضطراب کے غیر مختتم فتنے بھی ہمارے پیش نظر ہیں جو حال میں اس قوم پر ہجوم کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے تحیر و استعجاب کی اسوقت کوئی حد باقی نہیں رہتی

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بلند پرواز ترقی پذیر، اور طوفان کی طرح بڑھنے والی قوم کو زمانہ کی جفاکاری کس سرعت کے ساتھ پستی کیطرف پٹک دیتی ہے۔ اور کس طرح ایک شدید القوی۔ صحیح المزاج اور دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ تندرست قوم بتدریج کچھ ایسے ضعف ونقاہت۔ فساد مزاج اور گوناگوں امراض کے بھنور میں گھر جاتی ہے کہ اس کے آخر کو اسکے اول سے نسبت ہی نہیں رہتی۔ اُمتہ کے یہ دونوں متضاد دور ہمارے سامنے ہیں۔ اور ہم اس ہمہ حیرت انقلاب، ترقی وتنزل۔ ارتقاء وانحطاط۔ رفعت وپستی اور سربلندی ونگونساری کے متضاد مدارج پر اسلئے غور کر رہے ہیں کہ ان کے اسباب وعلل کے متعلق کوئی صحیح اور وزنی رائے قائم کریں۔

قوم کے مرض کی تشخیص

تفتیش اسباب کے میدان میں اُتر کر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ایک ہم ہی نہیں بلکہ اُمتہ کے سیکڑوں قابل اور منفرد دماغ اسی تگ ودو اور سراغرسانی اسباب میں اپنی پوری ہمت وطاقت کیساتھ لگے ہوئے ہیں اور مفتشوں کی کثرت سے اس پیش پا افتادہ قوم کی مثال بعینہ اس مریض کی سی ہوگئی ہے جس کے ہر بُن مُو میں مرض سرایت کرچکا ہے گوشت پوست اور ہڈیاں تک سوکھ گئی ہیں، رنگ زعفرانی ہے قویٰ معطل اور ہاتھ پیر جواب دیچکے ہیں۔ قوم کے ہونہار طبیب اور ماہر ڈاکٹر بالین قوم پر جمع ہیں۔ تاکہ مرض اور اسکے حقیقی اسباب کی تشخیص کریں۔ اور پھر ازالۂ اسباب کے ذریعہ استیصال مرض کی تدابیر عمل میں لائیں۔

ہر ایک نے اپنے اصول فکر اور پرواز عقل کے مطابق اسباب مرض کو سمجھا اور علاج تجویز کیا۔ کسی نے قوم کا حقیقی مرض تنگدستی وافلاس کو سمجھا اسلئے اسنے تجویز کیا کہ قوم کو دولت مند بننا چاہیئے۔ اور دولت کی فراہمی کے ذرائع تجارت۔ زراعت حتیٰ کہ سودی لین دین اور بوی بینک بے دریغ استعمال کرنے چاہئیں۔ کسی نے کہا کہ اصل مرض جہالت ہے۔ اور اس کی دوا کالجوں اور اسکولوں کی چہار دیواری میں ملسکتی ہے۔ کسی نے کہا کہ اسکی بیماری غلامی ہے جب تک کہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر شوکت ورفعت اور حریت وآقائی کا تاج اسکے سر پر نہ رکھدیا جائے۔ قوم نہیں پنپ سکتی۔ کسی نے

بتلایا کہ اسکی صحۃ کو نفاق و شقاق کے جراثیم نے کھو دیا ہے۔ جبتک کہ قوم میں اتحاد کی لہر نہ دوڑا دیجائے
مریض کے چہرے پر کبھی صحت کی بشاشتہ نمایاں نہیں ہو سکتی۔ کسی نے کہا کہ اسکے ایوان صحۃ کو بیکاری نے
ویران کر دیا۔ اور اس میں تشویش و تشتت افکار کا ضعف پیدا کر دیا ہے۔ جبتک کہ صنعتہ و حرفتہ اور
دوسرے کار آمد مشغلوں سے اسکی تعمیر نہوگی۔ قوم کی گئی ہوئی جمعیت اور یکسوئی (جو صحۃ کی اساس ہے) واپس
نہیں آسکتی۔

بہر حال ہر ایک بہی خواہ نے دردمندانہ طریق پر اپنے جذبات اصلاح کو سامنے رکھکر تشخیص مرض اور
تجویز علاج کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقیقت تک انمیں سے کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ ان
ظاہر بین اور سطح نظر اطبا کی نگاہیں مرض کے صرف ظاہری اسباب میں الجھ کر رہگئیں۔ اور اسباب
کی تہ یا علۃ العلل تک انکی رسائی نہوئی۔ وہ یہ تو دیکھ سکے کہ قوم میں پستی کے نمایاں اسباب افلاس۔
غلامی۔ جہالت۔ نفاق (اور انہی کے ہم معنی اور بہت سے الفاظ) ہیں لیکن اسطرف ان کا پیک عقل
نہ دوڑ سکا کہ یہ اسباب بھی تو بہر حال حوادث ہی ہیں اور جبکہ ہر حادثہ کے لیے سلسلہ اسباب میں کسی
سبب کی ضرورت ہے تو پھر یہ اسباب آخر کس سبب کی بنا پر امۃ میں نمایاں ہوئے۔ اور ان اسباب
کی تہ میں وہ کونسا اندرونی سبب ہے جو خفی طور پر اس قسم کے مہلک اسباب کی نمائش کر رہا ہے؟

مانا کہ افلاس پستی کا سبب ہے۔ لیکن پھر افلاس کا کیا سبب ہے؟ اور وہ کیوں پیدا ہوا؟ یہ بھی تسلیم
کہ غلامی قومیت کے لیے مخرب ہے لیکن آخر غلامی کس سبب کی بدولت انکی قسمت میں آئی؟ ہم
جانتے ہیں کہ جہل و نفاق اسباب ذلۃ و مسکنۃ ہیں لیکن پھر کس راہ سے یہ مہلک نفاق [illegible] قوم میں
دخیل ہوگئے؟ یہ بھی صحیح کہ بیکاری تشویش و تشتت اور پراگندگی کا سبب ہے لیکن آخر بیکاری نے اچھے
کار آمد اشغال کی جگہ کیوں سنبھال لی؟ پس جبکہ ان تمام اطبا میں سے کسی کا دماغ بھی اس اندرونی
اور مخفی دشمن کا پتہ نہ لگا سکا جو ان تمام اسباب ہلاکت کی جڑ اور سبب الاسباب ہے تو ظاہر ہے کہ انکی
تشخیص ہی پایۂ اعتبار تک نہ پہنچ سکی۔ چہ جائیکہ انکی تجویز علاج قابل عمل ہو۔ اور جبکہ تشخیص و تجویز
دونوں ہی مخدوش ہوں تو ایسے مطب سے کس طرح شفا یابی مریض کی توقع باندھی جا سکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ مریض روز بروز بقا سے دور اور فنا سے نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے۔

گفت ہر دارو کہ ایشان کردہ اند	آن عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال درون	استعیذ اللہ مما یفترون
ہرچہ کردند از علاج و از دوا	رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

پس جبکہ ان اطباء ظاہر کی تمام تدابیر تا حال بے سود ثابت ہوتی رہیں تو آؤ ہم سب ملکر ان باطنی اطباء کی طرف رجوع کریں جو امراض کے مخفی اور تحتانی اسباب پر براہ راست حضرت مسبب الاسباب جل مجدہٗ کی طرف سے مطلع ہو کر تمام پیچیدہ امراض کے حقیقی بواعث کا نہایت سہولت سے پتہ لگا لیتے ہیں۔ اور جن کے کامیاب علاجوں سے کتنی ہی مردہ اقوام نے دوبارہ جنم لیا اور زندگی سے متمتع ہونے لگیں۔ پھر ان میں سے بھی بالخصوص اس سرخیل اطباء روحانی محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامیاب مطب کی دہلیز پر سر انقیاد خم کر دیں جنکے تیر بہدف علاج نے عرب کی اس جاہلیتہ زدہ قوم کو زندہ کر دیا تھا۔ جو جہالت و افلاس نفاق و شقاق اور غلامی نفوس کے انتہائی سے انتہائی درجہ میں پھنس رہی تھی نہ وہ خدا ہی کی رہی تھی نہ مخلوق ہی کی نہ اس نے ایمان ہی باقی رکھا تھا نہ شائستہ عمل ہی۔

جو اپنی بد اخلاقیوں اور بد عہدیوں کی بدولت اپنوں کو غیر اور غیروں کو دشمن بنا چکی تھی۔ جو انتہائی جہالت و سفاہت۔ نفاق و شقاق بدکاری و بد وضعی کی سبب اپنی علمی و عملی۔ مادی و روحانی اور منزلی و مدنی زندگی تباہ کر چکی اور انسانوں کی صفوں سے نکلکر ڈھوروں کے گلہ میں جا ملی تھی۔ اُسوقت اسی مقدس طبیب نے اپنے پر تاثیر معالجوں سے اس ڈوبتی ہوئی قوم کا جہاز طوفان ہلاکت سے نکالکر ساحل مراد پر پہونچایا اور اسکی مرضیلی کثافتوں کا تنقیہ کر کے اسے صحت و قوت کی سطح پر لا کھڑا کیا۔

حاذقش گو کو حکیم حاذق است	صادقش داں کو امین و صادق است
در علاجش سحر مطلق را بہ بیں	در مزاجش قدرۃ حق را بہ بیں

تجویز علاج

حضور کے اس روحانی معالجہ میں تم اسپر غور کرو کہ آپ نے مبعوث ہوتے ہی جب ان بیمار انسانوں سے معالجانہ خطاب فرمایا تو نہ تو یہ کہا کہ لوگو تم افلاس کیوجہ سے تباہی کے کنارے آگئے۔ اسلئے تم دولت جمع کرو نہ آپ نے تشریف لاتے ہی فراہمی دولت کیلئے سودی لین دین کے بینک قائم فرمائے۔ نہ چند کالجوں اور اسکولوں کا سنگ بنیاد نصب فرمایا۔ نہ پوسٹر اور اشتہارات دنیا میں شائع کرکے افواہی پروپیگنڈے کی بنیاد ڈالی، بلکہ ان تمام امراض کا ایک نہایت ہی مختصر اور دلپذیر علاج یہ تبلایا کہ لوگو تم سب کے سب مریض ہو اور میں تم سے اور تمہارے سب اگلوں اور پچھلوں سے زیادہ تندرست صحیح المزاج۔ معتدل الاخلاق، مستقیم الاعمال اور ایک پاک روحانیت سے بھرپور انسان ہوں پس تم میں سے جسے اپنی صحۃ و استقامۃ منظور ہے وہ مجھ جیسا ہونیکی سعی شروع کردے۔ میرے قول جیسا قول میرے عمل جیسا عمل میری عبادۃ جیسی عبادۃ اور میری عادت جیسی عادت بنائے۔ گویا اپنی زندگی کو میری زندگی پر ڈھالنے کی کوشش کرے۔ پس جو بھی ظاہر و باطن میں جسقدر میرے مشابہ ہوتا جائیگا اتنی ہی اسکی ظاہر و باطن کی صحۃ ترقی کرتی جائیگی۔ کیونکہ میں عالم کے لئے ہر قسم کی روحانی تندرستیوں۔ جسمانی پاکبازیوں اور قلبی دانائیوں کا اسوۂ حسنہ اور خدا کے اخلاق و کمالات کا مجسم نمونہ بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ میرے نقش قدم پر چلنا ہی تمام امراض کا قرار واقعی استیصال ہے۔

آپ نے ان مریضوں کو یہی تبلایا کہ میں تمہارے لئے ایک تیر بہدف نسخہ (قرآن) لایا ہوں، جو شفاء لما فی الصدور ہے۔ لیکن اس کی ترکیب استعمال صرف میرے ہی قول و عمل سے معلوم ہوسکتی ہے۔ کیونکہ قرآن میں جو چیزیں علوم و معارف میں وہی چیزیں میری ذات میں آکر اخلاق و اعمال ہیں۔ جو بلند پایہ انسانیت کے احوال و کیفیات قرآن کی بلیغ معنویت میں مستور ہیں وہ میری روح پر وارد ہوکر واقعات و مشاہدات ہیں۔ گویا خدا کا ایک قرآن علمی ہے جسکو میں وحی سے بولتا ہوں اور ایک قرآن عملی ہے اور وہ خود میں ہوں۔ پس میں قرآن کی مجسم تفسیر اور اسکا عملی حل ہوں۔ یعنی میں اور کتاب اللہ دو نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ کتاب الٰہی میں علوم کے رسوم و دوال ہیں اور مجھ میں ان علوم کے مناشی و اعمال۔ اسلئے میرا کہا ہوا قرآن کا علم ہے

اور میرا کیا ہوا قرآن کا عمل وکان خلقہ القرآن پس میں قرآنی علوم کا نمونہ عمل اور اسوہ حسنہ دکھلانے کیلئے بھیجا گیا ہوں تاکہ مریض دنیا میرے عمل کو دیکھکر قرآنی نسخوں کا استعمال سیکھ جائے۔

بہرحال قرآن جسطرح ایک جامع علوم کتاب تھی اسیطرح اسکے علوم کیلئے آپ کی ذات اقدس ایک جامع اعمال ذات تھی۔ چنانچہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے پاک اور مطلوب صورت آپ نے عملاً قائم کرکے نہ دکھلا دی ہو۔ صورت وسیرت۔ عادۃ وعبادۃ۔ آداب واخلاق۔ تہذیب ومعاشرت حب وبغض۔ دوستی ودشمنی۔ سفر وحضر۔ رزم وبزم۔ کہانا اور پینا۔ سونا اور جاگنا۔ اور خلاصہ یہ کہ موت وحیات کے تمام اچھے اور معقول نمونے جو قرآنی اور علمی شکلوں میں سربستہ تھے آپنے اپنے عمل سے ان کی صورتیں قائم فرما دیں اور ہر ہر شعبہ زندگی کے متعلق بتلایا کہ اسکی یہ صورت اچھی ہے اور یہ بری۔ یہ نقشہ عمل بھدا ہے اور یہ خوشنما۔ یہ حسین ہے اور یہ قبیح۔ غرض آپنے ۔۔۔۔۔ ان جاہلیتہ زدہ مریضوں کا واحد علاج یہی بتلایا۔۔ کہ وہ اپنی زندگی کو آپ کی حیاۃ طیبہ پر منطبق کریں کہ آپ ہی کی زندگی کمالات الٰہی کا نمونہ ہونے کیوجہ سے تمام عالم کی زندگیوں کے صلاح وفساد اور صحۃ وسقم کا ایک حقیقی معیار ہے۔ قرآن نے ببانگ دہل اس دعوی کی تصدیق کی اور اعلان کردیا کہ۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر۔	تم لوگوں کیلئے یعنی ایسے شخص کیلئے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ

کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

پس جونہی کہ عرب کے وحشیوں نے اپنے علم وعمل کا رخ اس قبلہ علم وعمل (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف پھیرا یعنی اپنے اعتقادات واعمال اور نیات وافعال کو آپ کے نیۃ وعمل پر منطبق کیا۔ اور اس اسوہ الٰہی اور نمونہ اخلاق ربانی پر پورے اترے دوں ہی وہ دنیا کے علماء سے عالم تر اقویا سے قوی تر مہذبوں سے فائق اور متمدنوں کے استاد بن گئے۔ الٰہیات میں وہ رشک حکماء کہلائے علوم ذات وصفات میں عرفا مانے گئے علم طبعیات وعقلیات میں رشک ارسطو وافلاطون تسلیم

لہ آپ کا خلق بس قرآن ہی تھا۔ یہ مقولہ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے۔ جبکہ انسے اخلاق نبوی کے متعلق سوال کیا گیا تھا۔

کیے گئے۔ علم و اخلاق و عبادات علم معاش و معاد علم معاملات و سیاسیات میں غبطۂ ارباب دانش پکارے گئے۔ ان کی بدولت ریگستان عرب کی تہذیب نے مشرق و مغرب کی شائستگی کو ماند کر دیا یہودی و عیسائی، ہندی و چینی اور تمام مذاہب کی ناتمام تہذیبیں مخجل ہو کر آتشکدوں، بتخانوں کلیسوں اور رہبانیت کے تنگ و تاریک زاویوں میں جا چھپیں۔ دنیا کے کتب خانے ٹٹولو اور تصانیف کے دفتروں کو کنگھالو تو نظر آئیگا کہ جہاں بھی شائستگی کا کوئی ذرہ چمک رہا ہے وہ عربی ہی علوم کے آفتاب کی کوئی ہلکی سی تابش ہے۔ اور پھر معلوم ہوگا کہ یا دنیا اُن کے نام سے بک رہی ہے اور یا ان کی ریزہ چینی پر مجبور ہے۔ ادھر جبکہ انہوں نے اپنے اخلاق کو اس خدائی نمونہ کے اخلاق پر منطبق کیا تو ان کے مکارم اخلاق، شجاعت و سخاوت، مروّت و راستبازی۔ حلم و عفو، صداقت و دیانت۔ غنا و توکل اور ایفاء عہد وغیرہ اس درجہ پر پہونچے کہ دنیا کے گردن کشوں کو انہوں نے مسخر کر لیا۔ وہ ایسے محبوب خلائق بنے کہ دنیا ان کے پسینے کو اپنے خون سے تولنے لگی۔ ان کے اخلاقی و تمدنی اور اقتصادی کارنامے عالم کے آفاق پر اس طرح چھا گئے کہ عالم کی تسلیم و رضا اُن کے قدموں میں آپڑی۔

بہرحال اُس اسوۂ حسنہ کی علمی و عملی پیروی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ دور جو ان مربیان عالم کی بدولت دورِ جاہلیۃ کہا جاتا تھا، اب صحابہ کی اس متقی اور عدول زندگی کی بدولت اس کا نام خیر القرون ہوا اور وہ دین و روحانیت اور وہ عام صداقت آمیز عزائم و اعمال کے خاطر سے دنیا کا زرّیں عہد اور تمام قرون سے فائق و برتر زمانہ بنگیا۔ وہی تپ کہنہ کے مریض جن سے ہلنا جلنا اور کروٹ بدلنا دشوار تھا ایسے بھلے چنگے بنے کہ انہوں نے اپنی ایک جنبش سے کرۂ دنیا کو ہلا دیا اور عالم ہی کو کروٹ دیدی۔

دُر فشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا	دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بنگئے	کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اگر چشم فراست سے دیکھو تو عربی قوم کے زبردست انقلاب کا حاصل تمہیں یہ نظر آئیگا کہ ایک حال سے اُن کو ہٹایا گیا اور ایک حال کی طرف انکو پہونچایا گیا۔ اور یقیناً جس حال سے اُن کو ہٹایا گیا وہی

ان کا مرض تھا ورنہ اس سے ہٹانے کی ضرورت نہ تھی اور جس حال کی طرف ان کو لایا گیا وہی حال ان کی شفا تھا ورنہ اسکی طرف لانے کی ضرورت نہ تھی اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ حالت جو ان سے سلب کی گئی اصولی طور پر ان کا تشتت افکار واعتقادات قلب وقالب کی آزادی اور کسی ایک اسوۂ ربانی کا پابند نہ ہونا تھا، اور وہ حالت جو ان میں پیدا کی گئی وہ ان کا وہ تقید تھا جو اسوۂ الٰہی کے ساتھ صورتاً وسیرۃً انہوں نے قائم کر لیا اور تمام ماسوا کے رشتے توڑ کر ایک اسوۂ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہو گئے پس جاہلیۃ کے اس مہلک مرض اور اسکے کامیاب علاج کو سامنے رکھکر بآسانی یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ بسیط ارض پر کسی نمونۂ ربانی کا علماً وعملاً پابند ہو جانا ہی سب سے بڑی روحانی صحت ہے اور اس سے انحراف کر کے بے قید زندگی بسر کرنا یا صرف اپنے من گھڑت اسوہ ہائے خیال وعمل کا پابند ہو جانا ہی سب سے بڑا روحانی مرض ہے۔

فکر خود درائے خود در عالم رندی نیست　　　کفر است دریں مذہب خود بینی وخود رائی

اس نتیجہ کو پیش نظر رکھکر اب ہمارے لئے یہ باور کرا دینا کچھ دشوار نہ رہا کہ آج ہمارے امراض کے حقیقی اسباب نہ افلاس وغلامی ہے نہ جدل وخلاف اور جہالت ولاعلمی بلکہ ان تمام اسباب مہلکہ کا حقیقی سبب اور صرف ایک سبب یہی ہے کہ ہم میں پیروی نبوۃ کا داعیہ اور انقیاد رسالۃ کا جذبہ صادقہ نہ رہا۔ ہماری صورتوں اور سیرتوں نے بجائے اتباع کے ابتداع کی راہ اختیار کر لی بجائے تقید مسلک کے آزادی رائے نے ہمارے قلب ودماغ پر قبضہ کر لیا اور پھر نہ صرف ذوق اتباع فنا ہی ہو گیا بلکہ ہم اسکے دائرۂ تصور سے بھی نکل گئے۔ اور اسی لئے اسلام کے ابتدائی قرون کے برعکس آج ہم کو بیکسی وبے بسی بے وقعتی وبے وزنی شکستہ بالی وبدحالی نے ہر چہار طرف سے آگھیرا۔ پس جبکہ ہم قرون اولی کی مثالیں نہ رہیں تو ان کے مبارک آثار بھی ہم سے محجوب ہو گئے۔ اگر زندہ دلی کی ان ہی جیسی یادگاریں آج بھی ہوتیں اور انہی جیسی حقیقۃ وہیئۃ، ان ہی جیسی صورت وسیرت اور شئون نبوۃ کے ساتھ ان ہی جیسی شیفتگی اس دور ابتلاء میں بھی پائی۔ تو وہ تمام نتائج وثمرات بھی قدرۃً رونما ہو جاتے جو ان سے کبھی ظہور پذیر ہوئے تھے لیکن آج جبکہ وہ مثالیں مفقود ہیں

تو وہ زریں کارنامے اور سطوت و شوکت کے سنہرے آثار بھی روکش عدم ہیں جنکی توقع ایسی مثالوں سے باندھی جاسکتی۔ اگر پھر وہی چیز ہم بختوں کی طرف لوٹا دی جائے جو کبھی ان سعید انسانوں میں پیدا کردی گئی تھی تو بلاشبہ ہماری وہی ترقیات پھر دوبارہ لوٹ سکتی ہیں جنہوں نے ایک دفعہ ساری دنیا میں سنسنی پیدا کردی تھی اور عالم کو لرزا دیا تھا۔ اسلئے نتیجۃً کہنا پڑتا ہے کہ اسلامی قوم کا تمامتر عروج و ارتقاء ان جیسا ہونے اور ان کی ظاہری و باطنی مشابہت پیدا کرنے میں پنہاں ہے اور جبکہ اسی مشابہت و پیروی اسوۂ حسنہ کی بدولت قرن اول کی صلاح و فلاح اور عالمگیر سرداری دنیا پر قائم ہوئی تو پھر ضرور ہے کہ اسی اتباع و پیروی کی بدولت آج بھی دنیا صلاح و فلاح کا چہرہ دیکھ سکتی ہے ورنہ کچھ دور نہیں کہ امت پر پھر وہی دور جاہلیۃ عود کر آئے جس کا اس اتباع رسالۃ کے دور سے پہلے دور دورہ تھا۔ والعیاذ باللہ۔ امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها۔	اس امۃ کا آخری حصہ بھی اسی چیز سے صلاح پاسکتا ہے جس چیز سے اسکے اول حصہ نے اصلاح پائی۔

پس ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے حسن و قبح یا شوکت و پستی کا واحد معیار ایک یہی نبوۃ کا اسوۂ حسنہ نکل آیا اور تمام کھلے اور چھپے ہوئے امراض کا واحد اور موثر علاج اگر ہے تو صرف یہی کہ ہم بجائے آگے بڑھنے کے چودہ صدی پیچھے ہٹ کر اس اتباع اسوہ کا ربقہ اپنے گلے میں ڈال لیں اور ابتداع کو چھوڑ کر اتباع اختیار کرلیں۔

قرآن کریم نے اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی کا فرمان ان پر شوکت الفاظ میں صادر فرمایا کہ۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر۔	تم لوگوں کیلئے یعنی ایسے شخص کیلئے جو اللہ سے اور یوم آخرۃ سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا۔

دوسری جگہ حکماً کہا کہ رسول کے لائے ہوئے علمی و عملی نمونوں کو قبول کرو۔

ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔	رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیں رک جایا کرو۔

پھر خود صاحب اُسوہ (جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے) اپنے ایک خطبہ میں فرمایا۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ ۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ بہترین علم اللہ کی کتاب ہے اور بہترین خصلت (عمل) خصلت محمدی ہے اور بدترین امور نئی نئی بدعتیں ہیں۔ اور ہر ایک بدعۃ گمراہی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

من حفظ سنتی اکرمہ اللہ تعالی باربع خصال المحبۃ فی قلوب البررۃ والھیبۃ فی قلوب الفجرۃ والسعۃ فی الرزق ۔ والثقۃ فی الدین

جس نے میری سنت کا تحفظ کیا خدا تعالی چار باتوں سے اسکی تکریم فرمائینگے۔ پاکبازوں کے دل میں اسکی محبت ڈالدینگے اور بدکاروں کے دلوں میں ہیبت۔ رزق کو فراخ کردینگے اور دین میں پختگی نصیب فرما دینگے۔

امام زہری نے فرمایا۔

الاعتصام بالسنۃ نجاۃ ۔

سنت کا دامن سنبھالنا نجات ہے۔

امام مالک نے فرمایا۔

ان السنۃ مثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا ومن تخلف عنھا غرق ۔

سنت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اسمیں سوار ہوگیا بچ گیا اور جو اسمیں نہ آیا غرق ہوا۔

پھر اس اتباع اسوہ سے انحراف کرنے پر قرآن نے دنیا کے فتنوں اور آخرۃ کے عذاب الیم سے ڈرایا ہے

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم ۔

سو جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہیے کہ اُنپر کوئی آفت آن پڑے یا اُن پر کوئی دردناک عذاب نازل ہو جائے۔

کہیں شقاق رسول اور عامۂ مسلمین کی راہ سے الگ ہوجانے پر جہنم کی دھمکی دی۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولّی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا ۔

جو شخص رسول کی مخالفت کریگا بعد اسکے کہ اسکو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑ کر دوسرے رستہ ہو لیا تو ہم اسکو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دینگے اور اُسکو جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بری جگہ ہے جانیکی۔

کہیں دھمکایا کہ تحکیمات نبویہ سے دل تنگ ہونے پر ایمان ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

فلا و ربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

پھر قسم ہے آپکے رب کی یہ لوگ ایماندار نہونگے جبتک یہ بات نہو کہ انکے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اسمیں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرا دیں پھر اس آپکے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا تسلیم کرلیں

اور کہیں فیصلہ سنایا کہ کسی کام میں حکم خدا و رسول آجانے کے بعد کسی کا اپنا اختیار اس کام میں باقی نہیں رہ سکتا۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم۔

اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ انکو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے۔

اور آخر میں قرآن کے مصدق اول حضرت صادق مصدوق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی یہ بلیغ اور جامع شرح فرمادی کہ۔

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ

تم میں سے کوئی بھی اسوقت تک ایماندار نہیں ہوسکتا جبتک کہ اسکی خواہشات میری اور دہ احکام کے تابع نہ ہوجائیں۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست

آنجا جزآنکہ جاں بسپارند" چارہ نیست

پس جبکہ اسلامی زندگی کے تمام پہلوؤں کی صحت وسقم کا معیار صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاۃ طیبہ ٹھہر گئی تو اب تم تہذیب وتمدن کا اچھے سے اچھا نمونہ لاؤ عبادت وریاضت اور نفس کشی کی سخت سے سخت مثالیں پیش کرو، اور اخلاق ومعاشرت کی بے حد خوش آیند صورتیں دکھلاؤ لیکن اگر وہ اس ربانی نمونہ پر منطبق نہوں۔ جو تمہارے لئے بھیجا گیا اور ٹھیک اسی اسوہ کے مشابہ نہوں جو کامل بناکر اتارا گیا تو ناممکن ہے کہ وہ قبولیت کا شرف پاسکیں یا بارگاہ الہی تک پہنچ سکیں۔

بہرحال قبولیت صرف انہی اوضاع واطوار اور احوال وکیفیات میں دستیاب ہوسکتی ہے۔ جن کو آپ اپنی ذات اقدس میں لیکر شرف افزائے عالم ہوئے۔ اور اس کے سوا ہر راہ خطرناک

و در ہر طریق ہلاکت انگیز ہے۔

آنکس کہ شد متابع امر تو شد نجا	وانکو خلاف رائے تو در زید قد ہلاک

اسی اتباع سنن نبوی کا نام اتباع سنّتہ یا تشبّہ بالانبیا رہے۔ اور اس اتباع سے منحرف ہو کر دوسری ملل و اقوام کی پیروی کرنے کا نام تشبّہ بالاغیار ہے جس پر بحث کرنے کیلئے ہمیں اسوقت قلم اٹھانے کی توفیق ہو رہی ہے اور ہمیں اس خوش قسمتی پر انتہائی مسرۃ ہے کہ ہم نے اسلام کے ایک ایسے اصولی مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے جو مسلم افراد اور مسلم قوم کی مقبولیت و نامقبولیت کا واحد معیار اور رضاء و نارضاء الٰہی کا تنہا مدار ہے اور جس کی ہمہ گیری سے اسلامی تعلیم کا کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں ہے۔

ہم نے بحث تشبّہ کی اس پہلی جلد کو جو اس وقت ہدیہ ناظرین ہے، دو بابوں پر منقسم کیا ہے پہلے باب میں ہم محققانہ طریق پر متعدد فصلوں کے ذریعہ مسئلہ تشبّہ کا ماخذ و منشا اور اسکی عقلی و شرعی حقیقت وغیرہ بے نقاب کریں گے۔ اور دوسرے باب میں مناظرانہ طرز پر ان تمام شبہات کا استیصال کرینگے جو متفرنجوں یا سادہ لوحوں کیطرف سے اس مسئلہ میں پیدا کیے گئے۔ اور آخر میں ایک تتمہ کے ذریعہ ایسے آثار و مضامین پیش کریں گے جنمیں ناصحانہ طور پر تشبّہ بالکفار سے انذار کیا گیا ہے۔ اور اس پہلی جلد کے بعد جسمیں محض اصولی حیثیت سے مسئلہ پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ بقیہ دوسری جلد میں انشاءاللہ تشبّہ کی فروعات اور جزوی مسائل کا ذخیرہ پیش کیا جائیگا۔ و باللہ التوفیق و بیدہ ازمۃ التحقیق

باب اوّل

فصل

مسئلہ تشبّہ کا منشا اور ماخذ

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک نہایت ہی کامل و مکمل، جامع و مانع اور ناقابلِ تبدیل دستورِ عمل کا عنوان ہے۔ زندگانی کے وہ تمام شعبے جنکا جامعیت کیساتھ دنیا کی کوئی ملّت احاطہ نہ کر سکی تھی، اسلام کے وسیع دائرہ نے ان سب کو اپنے اندر انتہائی کمال و تمام کے ساتھ لے لیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

تمام بود بیک حرف گرم و ما غافل	حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

اس نے اپنی کوئی اصل و فرع ایسی تشنہ اور ادھوری نہیں چھوڑی کہ ایک جویائے تسلی کے لئے کسی کھٹک یا حیرانی کا باعث بنے۔ گویا اس نے انتہائی جامعیت کے ساتھ سارے ہی کمالات و منافع اور دینوی و اخروی بہبود کے اصول اپنے لئے سمیٹ کر دنیا کے اور تمام قوانین کے لئے سوائے نقصان و مضرۃ، در حقیقت جدوی کے کچھ نہیں چھوڑا اور اسی لئے جہاں تک معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے عموماً اقوام عالم کی مذہبی سوسائیٹیاں اسی مرکز کمال کیطرف سمٹی چلی آ رہی ہیں۔

چنانچہ آج مغرب میں تو یورپ کے دانشمند اسکے صداقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں اور مشرق میں ہندو اور آرین قومیں کھلی بت پرستی سے تنگ آ کر اسلام کے دامن توحید میں پناہ لینے کے لئے جھک رہی ہیں پس جبکہ اس کے حُسنِ کمال اور نفعِ لازوال نے غیروں کو نہ صرف اپنی ہی خوشہ چینی پر مجبور کر دیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنوں کو کسی آن بھی دوسروں کے ناقص خرمنوں سے ریزہ چینی کی صلاح دے؟ یا اس خوردہ چینی سے باز رکھنے کی سعی نہ کرے؟ ہرگز نہیں کیونکہ اسلام آ جانیکے بعد غیر مسلم اقوام کے تمام اصولِ علم و عمل دنیا کی روحانیت کے لئے یا مضر ثابت ہونگے یا ناقص اور اس مضرۃ و نقصان کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ان منسوخ شدہ ملتوں کے تمام احکام (خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی۔ تمدنی ہوں یا اقتصادی)

تین قسم پر منقسم ہیں۔

(۱) ایک وہ احکام ہیں جنکو صراحتہً اسلام نے منسوخ کر دیا کہ وہ دنیا کی روحانی مزاج کے موافق نہیں رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اسلام آ جانے کے بعد ایسے احکام کو دستور العمل بنا لینا یقیناً قسم قسم کی جسمانی و روحانی مضرتوں کا استقبال کرنا ہے اگر فی الحقیقت ان احکام کے نسخے دنیا کی مریض ہستیوں کیلئے اسی طرح شفا بخش اور موافق مزاج رہتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسلام ان کو منسوخ کر کے نئے نسخے پیش کرتا

(۲) دوسری قسم کے احکام وہ بدعات و محدثات ہیں جنکو یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان یا دوسری ملتوں کے رہنماؤں کے جذبہ تعبد۔ اور دماغی تعمق نے ملتوں میں اضافہ کیا۔ اور بعض اپنی خود ساختگی سے سلاسل و اغلال اُمتوں کے گلے میں ڈال دئے۔ ظاہر ہے کہ مضرۃ رسانی میں یہ خود ساختہ بدعات منسوخ اعمال سے بھی زیادہ بلند پایہ ہیں۔

(۳) تیسرے وہ اُمور ہیں جو اگرچہ صراحتہً منسوخ نہیں ہوئے لیکن جبکہ انکی مجموعی ملتہ ترمیم و تنسیخ یا زیادۃ و نقصان کی قابلیتہ رکھتی تھی (اور اسی لئے منسوخ بھی ہوئی) تو یہ اُمور بھی زیادتی و کمی قبول کر سکتے ہیں۔ اور کسی چیز کا زیادۃ و نقصان کے قابل ہونا اسکے غیر مکمل اور ناقص ہونیکی دلیل ہے ظاہر ہے کہ ایسی ناقص اشیاء کو اپنے لئے نظام عمل بنانا سرتاسر اپنے آپ کو ناقص، ادھورا۔ اور غیر مکمل چھوڑتا ہے۔

پس جبکہ اسلام نے ان ناقص و مضر اور ادھوری اشیاء کے مقابلہ میں بہت زیادہ منفعت بخش مکمل اور غیر قابل ترمیم و تنسیخ اشیاء پیش کیں تو صرف اسی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اُمتہ مرحومہ کو مردہ اقوام کی موت زدہ اشیاء اور ناقص و مضر اعمال سے بچانے پر زور دے۔ اور اپنے پیرؤں کو اتنا خود دار بنا سکھلائے کہ وہ اپنی مکمل متاع کے ہوتے ہوئے دوسروں کی ناقص پونجیوں پر نگاہ حرص نہ ڈال سکیں

پس شریعت اسلام نے اپنے اسی واجبی حق یعنی اپنے نفع و کمال اور منسوخ ملتوں کے نقصان و ضرر کو دیکھتے ہوئے منع تشبہ کا اصول قائم کیا تاکہ اُمتہ کو غیروں کی مضرات کے ظاہری و باطنی مشابہتہ یا بالفاظ دیگر حق و باطل کے اختلاط اور نفع و ضرر کی آمیزش سے باز رکھا جاسکے۔

ورنہ اسلام جیسی جامع اور لاتبدیل ملّت کا مسئلہ تشبّہ میں تساہل کرجانا یا اصولاً اس کو جائز رکھنا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ کمال کو نقصان سے بدلنے اور مضار کو منافع کے بدلہ خرید لینے کے لئے تیار ہے۔ اور یہ خود اسکی جامعیت پر عیب لگانا ہے نعوذ باللہ منہ۔

پس اگر سچ مچ کوئی قانون تشبّہ بالغیر سے روکنے کا حق رکھتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی کا مکمل قانون ہے اور گویا تشبّہ کا اصول صرف اسلام ہی کے لئے آسمان سے اُترا تھا۔

یہ اسلام کا منع تشبّہ پر زور دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مکمل طب یا ڈاکٹری تمام مستعملات کے نفع وضرر کی تفصیل کردینے کے بعد ہر چیز کی مخلوط خیر وشر میں سے تحصیل منفعت کی ترغیب دے اور اجتناب مضرت پر اپنا پورا زور صرف کردے۔ اسی طرح جبکہ شریعت نے اپنی تفصیلی تعلیمات میں واضح کردیا کہ ہر چیز کے خیر کا پہلو تو ملّت اسلامی کے لئے ہے۔ اور مضرت یا نقصان منفعت کے سارے پہلو دوسری ملّتوں کیلئے تو اب اس کا یہ اصرار بیجا نہ ہوگا کہ اسکے حلقہ بگوش ہر ہر جزئی میں اسی کے متبع بنکر منافع سے مستفید ہوں اور غیروں کی مشابہت سے بالکلیہ یکسو ہوکر مضرتوں سے بچیں۔

پس تشبّہ سے بچائے جانیکا حاصل یہ ہوگا کہ شریعت اسلام انسانی جذبات کو پامال کرنے کے بجائے صرف یہ چاہتی ہے کہ ان کا استعمال تو کیا جائے مگر شر سے الگ کرکے صرف خیر میں اور مضرۃ سے بچاکر صرف منفعت میں۔ اور یہ اسلئے کہ خیر وشر اور نفع وضرر دو متضاد کیفیتیں ہیں جو کبھی جمع نہیں ہوسکتیں۔ بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے عدم کا مقتضی ہے۔ اگر بنی آدم کی بھوکی روح کو جو نہایت عجلت کے ساتھ غذاؤں کی جویاں ہے مضر اور بدترین غذاؤں کی طرف بڑھنے دیا جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ نافع اور پاکیزہ غذاؤں سے محروم رہ جائیگی۔ اگر اس نے اپنی عجلت پسندی سے مادہ معانی پر مبتدعات ومنسوخات کی کثیف غذائیں استعمال کرلیں تو ضرور ہے کہ وہ سنن انبیاء کی ستھری اور لطیف غذاؤں سے نہ صرف محروم بلکہ نفور بھی ہوجائے۔ کیونکہ شکم سیری کے بعد ہر غذا اگرچہ وہ کتنی ہی لطیف ہو مرغوب نہیں رہتی۔ اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ما ابتدع قوم بدعۃ الا نزع اللہ عنھم (کبھی کسی قوم نے کوئی بدعت ایجاد نہیں کی کہ خدا نے ایک

ویسی ہی سنت سے اسے محروم کر دیا ہو۔

چنانچہ یہ حقیقت بار بار مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ جو شخص طبعاً زنا یا فواحش و منکرات کیطرف مائل ہے وہ نکاح اور حلال ازدواجات سے ہمیشہ نفور رہتا ہے۔ کیونکہ اسکے مادی جذبات کے استعمال کا ایک ناپاک راستہ متعین ہو چکا ہے اسلئے وہ دوسرے راستے سے بیزار ہے۔

جو لوگ من گھڑت افسانوں، ناولوں اور قصص ملوک و سلاطین کے دلدادہ ہیں کم دیکھا گیا ہے کہ وہ سیر انبیاء اور آثار علماء و صلحا سے بھی وہی دلچسپی رکھتے ہوں۔ کیونکہ ان کا جذبہ تاریخ پسندی جبکہ ایک طریق میں غلو کے ساتھ استعمال ہوا تو دوسرے سے توجہ ہٹ گئی۔

جو لوگ مشاہد و مقابر اور آثار اولیاء کی حاضری کو فریضہ تعبدی کہنے میں غلو رکھتے ہیں عموماً وہ اللہ کے بیت حرام اور مشاعر حج کی حاضری کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کیونکہ ان کا یہ جذبہ صالحہ جبکہ ایک راستے سے گذرنے لگا تو لامحالہ دوسرا راستہ خود ہی چھوٹ گیا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کی عملی زندگی کے لئے اہل اللہ کے شخصی حالات ان کے عشق کی وارفتگیاں اور بیخودانہ شطحیات ہی سب سے بڑی حجت و برہان کا درجہ رکھتے ہیں وہ بیشتر وہی ہیں کہ کتاب اللہ کی غامض حکمتیں اور حدیث نبوی کا علمی و عملی ذخیرہ ان کے استدلال کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ جاذب توجہ بھی نہیں ہے۔

سینکڑوں وہ لوگ جو ارسطو اور ابن سینا کے دماغی اختراعات کے آب نما سراب ہی سے اپنی علمی پیاس بجھا لینا انتہائی کامیابی جانتے ہیں کم دیکھا گیا ہے کہ وہ اسی بے تاب ذوق و شوق کو لیکر خدا کی آیات اور اسکی تجھر منطق کے بحر بے پایاں پر بھی سیراب ہونے کیلئے گذرتے ہوں۔

ان تمام نظائر سے یہ نتیجہ مشاہد ہو جاتا ہے کہ انسان کے تمام مادی اور روحانی جذبات بالکلیہ خیر و شر۔ نفع و ضرر۔ نیک و بد کے دو متضاد پہلو نکلتے ہیں۔ اور کسی ایک کی طرف جھک جانا یقیناً دوسرے سے مستغنی بنا دیتا ہے۔ پس شریعت کے لئے یہ کسی طرح قابل التزام نہیں کہ وہ تشبہ بالغیر کی ممانعت کے ذریعہ تمام سبل متفرقہ کے مضر پہلوؤں اور ملل ناقصہ کے ناقص جذبات

سے بچا کر انسان کو صراط مستقیم اور ایک نہایت ہی سیدھی اور سچی راہ پر لگا دینے کی خواہشمند ہی اور اپنی بے انتہا شفقت سے چاہتی ہے کہ سارے روحانی دسترخوان لپیٹ کر صرف خدا کا وہ وسیع دسترخوان بچھا دے جس پر چُنی ہوئی غذائیں ہر قسم کی مضرۃ و منقصۃ سے پاک اور ہر طرح کی منفعت و جامعیت سے لبریز ہیں۔

ان کل آدب یحب ان توتی مأدبتہ وان مأدبۃ اللہ ھی القرآن (الحدیث)۔	ہر ایک داعی کے دعوت کھانیکو قبول کرنا ضروری ہی اور خدا کا دعوتی طعام یہ قرآن ہے۔

پھر شریعت نے اپنی بے انتہا شفقت سے اس وسیع دسترخوان پر نہ صرف دینی منافع ہی کی غذائیں لاکر چن دی ہیں، بلکہ دنیوی بہبود کی تمام الوان نعمت بھی قرینہ سے لاکر جمع کر دیے ہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک ایک مسلمان کی دنیا اس کے دین سے الگ ہو کر کوئی چیز نہیں۔ اور اس کی معاشرۃ کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں جس پر دین کی روشنی نہ پڑ رہی ہو۔ پس جس طرح منع تشبہ کا اصول تمام ابواب دین پر حاوی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ اسی طرح ہماری دنیا کا بھی کوئی پہلو اس کے دائرہ سے باہر رہ سکے۔ بلکہ اگر نگاہ غائر سے کام لو تو محسوس ہوگا کہ منع تشبہ کی ضرورت اگر تدین میں ہو تو تمدن میں اس سے کہیں بڑھکر ہے۔ کیونکہ غیر اقوام کا دین تو اپنی نمایاں کوتاہیوں کے سبب ایک مسلم کیلئے عموماً جاذب توجہ نہیں کہ وہ تشبہ کیطرف مائل ہو۔ لیکن یہ بہت ممکن ہو کہ اسکی متشبہانہ توجہ اسلام کی سادہ اور بے تکلف معاشرۃ سے جس کی اساس تقدس و تقدس پر رکھی گئی ہی ہٹ کر غیر اسلامی معاشرتوں کی نظر فریب رنگینیوں اور دلربایانہ تنعمات کیطرف منعطف ہو جائے جنکی بنیاد محض تلذذ و تعیش اور تمتع خلائق پر قائم ہے ع

	کہ تو طفلی و خانہ رنگین است	

اور ظاہر ہے کہ حظوظ دنیا کی یہی الوان بسا اوقات سادہ اور خام قلوب کو اپنے اندر منہمک کر کے اس اصل مقصد رجوع الی اللہ سے غافل کر دیتے ہیں جس کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی۔ اور پھر یہ نا عاقبت اندیش دل اس حقیقت تک نہیں پہونچتے کہ یہ تنعمات یہاں تو سرور و آرام

ہیں مگر عالم آخرۃ میں یہی چیزیں ہموم وآلام ہیں۔

وہ نہیں سمجھتے کہ یہی مادی تلذذات دجہ محض وسائل کا درجہ رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ان روحانی امور میں حارج اور سد راہ ہوجاتے ہیں۔ جنکو خدا نے تو مقاصد کا درجہ عطا فرمایا تھا۔ مگر ان غافل قلوب نے انھیں وسائل سے بھی گرا دیا۔

پھر ان نابینا قلوب کی آنکھیں اس بداہت کو بھی نہیں دیکھتیں کہ یہ خوشنما اور نگاہ فریب معاشرہ کتنی ہی راحت دِہ اور خوش منظر کیوں نہ ہو لیکن بہر حال اُنہی قلوب کی ساختہ اور تراشیدہ ہے جن میں کفر وفسق اور غفلت کی گندگی بھری ہوئی ہے اور جب کہ قلب جو ساری اقلیم تن کا سلطان ہے کفر کی مہلک مرض میں دم توڑ رہا ہے تو ناممکن ہے کہ اس اصل کا فساد فرع پر نہ پھوٹ نکلے۔ اور جوارح پھر جوارح کے تمام افعال واعمال اور تخیلات وافکار کا کوئی حصہ حسب حیثیت اس روحانی جانکنی سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے	کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پس کفار کی ساری ہی خوشنما معاشرۃ سے جو انجام کے اعتبار سے یقیناً مضرۃ انگیز اور نقصان رسان ثابت ہوتی ہے، بالکلیہ متارکت اور قطع مشابہت اس مسلم کے لئے ضروری ہے جس کو صرف پیشانی ہی کی آنکھ نہیں دی گئی بلکہ پیش آنی کی نگاہ دوربین بھی عطا ہوئی ہے اور جو کسی طرح ان اندھوں کی مانند نہیں جن کی انجام بینی کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں ہیں۔ کہ وہ عاجل میں پھنسکر آجل کی طرف آنکھ ہی نہیں اٹھا سکتے۔

ان ھؤلاء یحبون العاجلۃ ویذرون ورآءھم یوماً ثقیلاً۔	یہ لوگ کفار دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے ایک بھاری دن چھوڑ بیٹھے ہیں۔

بہر حال اُمتوں کے اسی علمی ضلال اور مرکز دین سے ہٹ جانے کو دیکھکر اسلام نے بطور پیشبندی جہاں منع تشبّہ کے اصول سے عبادات میں کام لیا ہے وہیں معاملات ومعاشرات میں بھی وہ اس تحفظ حدود سے غافل نہیں رہا اور اس نے دنیوی اُمور کے تمام ہی شعبے منع تشبہ کی حدود دیدئے ہیں

جیساکہ آئندہ واضح ہوجائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

الحاصل (۱) منع تشبہ ہی ایک ایسا اُصول ہے کہ جس کے ذریعہ شرائع اپنی حدود کو فنا اور التباس اور تباہ کن اختلاط سے بچاسکتی ہیں۔

(۲) اور تمام شرائع میں صرف شریعت اسلام ہی اس کی حقدار ہے کہ وہ اس اُصول سے کام لے کیونکہ دوسری تمام ملتوں کے مقابلہ میں خیر محض۔ کمال محض۔ اور منفعتہ محضہ صرف اسی کی حدود میں ہے پس بچائے جانے یا التباس سے محفوظ رکھے جانے کے قابل بھی صرف اسکی حدود ہوسکتی ہیں

(۳) اور اب یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکل آیا (جو اس فصل کا موضوع تھا) کہ منع تشبہ کا منشاء اور ماخذ شریعت اسلام کا کامل اور نافع محض ہونا اور دوسری ملتوں کا ناقص ومضر ہونا ہے۔ اگر معاذ اللہ اسلامی شریعت بھی ناقص ہوتی تو ضرور اس کی اجازت دی جاسکتی کہ جہاں بھی اوضاع کمال دستیاب ہوسکیں حاصل کی جائیں اور ان سے تشبہ وتخلق کیا جائے لیکن جبکہ ایسا نہیں تو پھر ایسی اجازت بھی کبھی نہیں دیجاسکتی۔

فماذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون۔	پھر حق کے بعد اور کیا رہ گیا بجز گمراہی کے؟ پھر کہاں پھرے جاتے ہو۔
خلاف پیمبر کسے رہ گزید	کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

منع تشبہ کی اہمیت وضرورۃ اور اس کا منشاء وماخذ دکھلا دینے کے بعد آئندہ فصل میں ہم اس کی اصلیت وحقیقت عقلی وحسی حیثیت سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ تشبہ کیا چیز ہے اور اس کے آثار ولوازم کیا ہیں، پھر ہر شخص خود فیصلہ کر سکیگا کہ آیا اس کی اجازت دی جائے یا اس سے باز رکھنے کی سعی کی جائے۔

فصل

تشبیہ کی حقیقت

عقلی اور حسّی حیثیت سے

رموزِ اہلِ حقیقت بگویمت تیغی
اگر بطالب معنی خبیر توانی کرد

کائنات کی ہر چیز کی اک مخصوص شکل ہے جس کے ذریعہ سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ جو چیز بھی پردۂ دنیا پر آتی ہے وہ اپنی شکل وصورت اور رنگ روپ ساتھ لاتی ہے تاکہ اسے اپنا وجود منوانے اور ممتاز ہو کر نمایاں ہونے میں کسی قسم کا التباس سدِ راہ نہو۔ خدائے حکیم وقدیر کے بے پایاں حکمت اور فیاض قدرت نے ہر حقیقت کو اس کے مناسب پیرایہ اور ہر باطن کو اسکے شایاں شان ظاہر بخشا ہے پس دنیا کی ہر ایک مستور حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی ہی شکل میں آتی ہے۔ اور کائنات کا ہر مکنون راز جب پردۂ انکشاف پر آتا ہے تو اس شکل میں جو اسکو بدر فطرۃ سے دیدی گئی ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں۔ انسان۔ شیر۔ گھوڑا۔ گدہا۔ وغیرہ پھر نباتات کی تمام قسمیں۔ درخت۔ گھانس۔ جڑی۔ بوٹی۔ بیل وغیرہ اسی طرح جمادات کی تمام صنفیں۔ اینٹ۔ پتھر۔ چونہ۔ ریت۔ مٹی وغیرہ سب ہی وہ اشیا ہیں کہ فطرۃ اپنی اپنی صورتیں ساتھ لائی ہیں۔ اور انھیں صورتوں کی بدولت دنیا میں ان کا امتیاز یا وجود قائم ہے۔

باختن لازم رنگ است دریں بازیگاہ
ہیچ تدبیر چناں نیست کہ بے رنگ شویم

اگر زید عمرو سے الگ دکھائی دیتا ہے یا ایک مکان دوسرے مکان سے علیحدہ نظر آتا ہے یا ایک کپڑا دوسرے کپڑے سے ممتاز معلوم ہو تو وہ یقیناً انہی خصوصیات ہیئۃ کے سبب جو ان میں مشترک نہیں بلکہ آپس میں جداگانہ اور ممتاز ہیں۔ یعنی ایک مکان کا جو مخصوص نقشہ ہم اپنے ذہن میں اتارتے ہیں وہ دوسرے کو میسر نہیں۔ اسلئے یہ مکان اس مکان سے الگ ہے یا کپڑوں کی شنا

کے وقت ہم ان کے سوت کی رقت و غلظت کپڑے کا چکنا اور کرخت ہونا دیکھکر ہی ایک کپڑے کو دوسرے سے امتیاز دیدیتے ہیں۔ اسی طرح جبکہ ہم زید کے چہرے اور قد و قامت کی وہ مخصوص صفات و اعراض دیکھتے ہیں جو عمرو کیلئے نہیں ہیں تو یہی زید کا امتیاز ہے جو اس کو عمرو سے الگ اور جدا ثابت کردیتا ہے۔ ان اعیان کو چھوڑکر اب اعراض میں آؤ تو یہی صورتوں کا اختلاف وہاں بھی پھیلا یا ہوا ہے جس نے ہر ایک کو امتیاز اور خودی و ہستی کی دولت دے رکھی ہے۔ نور کی شکل اور ہے اور ظلمة کی اور۔ دن کی حقیقت جب ظہور کرتی ہے تو اپنی ہی نورانی شکل پر اور رات جب ظاہر ہوتی ہے تو اپنی ہی تاریک اور بھیانک شکل پر۔ الوان کو دیکھو تو سیاہ رنگ کی وہ شکل نہیں جو سرخ کی ہے اور سرخ کی وہ نہیں جو سبز و سیاہ کی ہے بلکہ ہر ایک اپنے صوری امتیازات کو لئے ہوئے ہی اپنے وجود کی نمائش کر رہا ہے۔

پھر نہ صرف کائنات کی جزئیات کا جزئیات بنکر رہنا ہی ان امتیازات کا رہین منت ہے۔ بلکہ عالم کی کلیات اور مجموعے بھی باہمی فصل و تمیز میں انہی مخصوص اشکال و اعراض کے دستنگر ہیں۔ ایک جنس دوسری جنس سے ایک نوع دوسری نوع سے اور ایک صنف دوسری صنف سے محض انہی خصائص کے بدولت اپنے مستقل وجود دکھائے ہوئے ہے۔

مثلاً جمادات کے نوعی دائرہ میں جب ہم پتھروں کی تلاش میں نکلتے ہیں تو کبھی پتھر کے دھوکے میں ریتہ اور لکڑی نہیں اٹھالاتے کیونکہ پتھر کی اک قدرتی شکل متعین ہے جس سے وہ پہچانا جاتا ہے اسی لئے نہ پتھر کو اینٹ کہہ سکتے ہیں نہ اینٹ کو پتھر، نباتات کو لو تو آم دیکھکر ہمیں کبھی سیب و انار کا دھوکا نہیں لگتا کہ ان کی صورتیں ممتاز ہیں۔

حیوانات میں اگر ہم انسانیت کے جویا ہوں تو اس کو کس شکل میں تلاش کریں؟ آیا گدھے گھوڑے اور شیر کی صورتوں میں یا اس کے دوسرے ابنا جنس کی شکلوں میں؟ نہیں بلکہ انسانیت کو انسان ہی کی شکل میں پایا گیا ہے اور شیر کی مفترسانہ حقیقت کو اسی کی صورت میں۔ کیونکہ شیر کو جو نوعی حقیقت چیر پھاڑ وغیرہ اور جو نوعی صورت یعنی مخصوص الوان و اعراض بدرنفرة سے

دیے گئے ہیں وہ انسان کو نہیں ملے، اس لئے شیر انسان نہیں۔ اور ادھر انسانی قوٰی میں ادراک و تصور کی وسیع طاقت۔ ایجاد و اختراع کی زبردست قوۃ۔ نفاست و نزاہۃ کی خوش آیند صفت لباس اور زینت آرائی کی خوش منظر حالت۔ کھانے اور پینے میں قسم قسم کی جدۃ پھر ظاہری قوٰی میں چہرے اور جسم کی وہ پاکیزہ صورت جو انسان کے حصہ میں آئی ہے وہ شیر کو میسر نہیں اس لئے انسان شیر نہیں۔ بلکہ تمام ہی حیوانات سے الگ ایک ممتاز حیوان ہے۔ اگر اس کے ظاہر و باطن کو ان خصوصیات سے محروم کر دیا جائے تو یقیناً جملہ بے شعور حیوانات کے وہ بھی ایک عجیب و غریب شکل و شمائل کا حیوان۔ اور یا صرف ایک ذی حرکت اور گول مول کرہ ہو جائے۔

پھر انسانی نوع کے افراد میں باوجود اتحاد نوعی کے ایک صنفی تقسیم جاری ہو جاتی ہے۔ جو انہی خصوصیات اور مخصوص آثار کا نتیجہ ہے۔ زن و مرد کی حقیقت ایک ہے۔ پھر ان کے حیوانی و نفسانی جذبات اور فطری اقتضاءات متحد ہیں۔ لیکن پھر بھی باہم ایک تفریق عظیم ہے۔ جس نے متحد الحقیقت نوع انسانی کو دو صنفوں پر تقسیم کر دیا۔ ان کے اسماء بدلے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت سے تعبیر کرایا۔ ان کے احکام بدلے ان کے حقوق متفاوت ہو گئے۔ یہ سب انہی صنفی امتیازات (جسامت و نزاکت۔ صغر و کبر۔ اوضاع و اطوار بدن۔ اعمال ظاہر و باطن۔ اخلاق و ملکات وغیرہ) کی تفریق و تخصیص کا اثر ہے۔ کہ دو صنفیں باوجود ایک واجبی اور معتد بہ اتحاد کے زیر اختلاف آ گئیں اگر یہ صنفی خصوصیات ان دو صنفوں میں سے نکال دی جائیں تو یقیناً امتیاز بھی اٹھ جائے اور زن و مرد کے ایک ہو جانے سے یہ زبردست صنفی اختلاف ہی نابود ہو جائے۔

غرض زمین سے لیکر آسمان تک حیوانات ہوں یا نباتات و جمادات اگرچہ ایک ہی مادہ سب کا نشو و نما ہے اور ایک ہی خوان وجود سے ہر ایک کو حصہ ملا ہے۔ لیکن باوجود اس وحدۃ وجود اور توحید منشا کے خدا کی وسیع حکمت نے ان کی صورتوں میں اختلاف ڈالدیا تاکہ ایک سے دوسرا پہچانا جا سکے۔ ان میں امتیاز قائم رہے اور اس طرح ہر ایک سے جو منافع اور اغراض متعلق ہیں وہ پورے ہوتے رہیں اگر تلبیس کی رو سے ایک نوع کا کوئی فرد اپنی خصوصیات کو

چھوڑ کر دوسری نوع کے دائرہ خصوصیات میں داخل ہو جائے تو پھر ہم اسکو اس پہلی نوع کا فرد
نہیں کہہ سکینگے بلکہ اس دوسری اختیار کردہ نوع کا اگر بالفرض ایک گدھا کسی ذریعے انسانی
شکل اختیار کرے۔ اور بالکل انسانوں جیسا ایک انسان ہو جائے تو پھر کوئی بتلائے کہ کیا اسکو باوجود
اس خوشنما چہرے اور قد و قامت کے بھی گدھا ہی کہینگے؟ کبھی نہیں بلکہ انسان! ورنہ اگر اس انسانی
شکل میں بھی ایک گدھا گدھا ہی پکارا جائے تو پھر اس انسانی شکل میں انسان کو صرف انسان
کہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

دیکھو ایک شعبدہ باز جب ایک رسی کو اپنے ٹوکرے میں بند کرے اس پر اپنا ڈنڈا پھرائے
اور تھوڑی دیر میں ٹوکری اٹھا کر رسی کے بجائے ایک چلتا پھرتا سانپ نکالدے تو کیا اس تبدیل
ہیئت کے بعد بھی اسکو رسی ہی کہینگے؟ ہرگز نہیں۔ اسلئے کہ سانپ اور رسی کی شکلیں جدا جدا متعین
ہیں جب کسی شکل میں کوئی حقیقت ظہور کرے گی تو اسی شکل کے اسما اسی کے احکام اسپر جاری کردئے
جائیں گے اگر رسی نے ظاہر میں سانپ کا حلیہ لے لیا اور اس کے مشابہ ہوگئی ۔۔۔۔۔۔ تو وہ
بلاشبہ سانپ ہی پکاری جائیگی نہ کہ رسی اور لوگ اسی طرح اس سے خوف کھا کر دوڑنے لگینگے
جس طرح سانپ سے بھاگتے ہیں۔

غرض کائنات کی ہر ہستی کو خدا کے جود و کرم نے ایک مخصوص و ممتاز شکل دیدی اور وہ
اپنی مستور حقیقت کو اپنے نام سے اسی شکل میں نمایاں کر رہی ہے۔ جس کا لباس خلقی طور پر سے
پہنا دیا گیا ہے۔

دبنا الذی اعطی کل شیء خلقه ثم هدیٰ | ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکی خلقت بخشی پھر رہنمائی فرمائی

دنیا کبھی بھی اتحاد پسند اور یکسان و یکتا ہو جائے لیکن کائنات کی ان مختلف شکلوں اور
متفاوت صورتوں کے اتحاد و اختلاط کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ شاید ایک دیوانہ اور سڑی بھی اسے
پسند نہ کرے کہ رات اور دن ایک شکل کے ہو جائیں۔ نور و ظلمت میں کوئی امتیاز نہ رہے۔ سارے
عالم کی ایک ہی شکل ہو جائے۔ ایک ہی رنگ ہو۔ ایک ہی حجم ہو۔ اور سب سب ضبون بلکہ

وہ سب ایک ہی ہوں۔ گویا ان پر سب یا تمام کا اطلاق محض مجازی اور فرضی ہو جو انسان ہو وہی گدھا ہو اور جو گدھا ہو وہی شیر اور بکری بھی ہو۔ آم کے درخت کو ببول بھی کہا جائے اور ببول کو گلاب و یاسمن بھی پکارا جائے، جس کو ہم پتھر کہیں اسی کو اینٹ اور چونہ بھی کہیں۔ کل ہی جزو بھی ہو اور پھر وہی کل بھی۔ سیاہ میں سفید نمایاں ہو اور سفید میں سیاہ۔ زمین ہی آسمان ہو اور آسمان ہی زمین ہو۔ رات دن ہو اور دن رات۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ نہ زمین رہے نہ آسمان۔ نہ دن رہے نہ رات۔ نہ سفید ہو نہ سیاہ اور نہ عالم میں جزئی جزئی ہو نہ کلی کلی۔ ظاہر ہے کہ جب ذرات عالم میں اس تکوینی میل میل اور خلط ملط کی وجہ سے ایسی وحدت آجائے کہ ایک اور یکتائی کے سوا دوسرے اور دوئی کا پتہ نہ ہو۔ گویا سب کچھ ہونے کے بعد کچھ بھی نہ ہو تو نہ عالم کو اپنے اجزاء کی ضرورت رہتی ہے نہ اجزاء کو مجموعہ کی نہ دنیا کے لئے ان مختلف المظاہر موجودات کی حاجت رہتی ہے اور نہ اس عالم کو ہونے اور موجود کہلانے ہی کی کوئی ضرورت باقی رہجاتی ہے؟ اور پھر کونسا داعیہ اٹھتا ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ ایسی بے معنی اور غیر مفید کائنات کی بنیاد استوار فرمائے۔ (نعوذ باللہ منہ)۔

ان چند سطور سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ اگر اس مادی عالم کو اسی امتیاز شکن التباس میں بے ہیئتہ چھوڑ دیا جائے۔ اور اس کے اجزاء میں ایسی ہی تلبیس راہ پا جائے کہ جس کے ذریعہ موجودات میں کوئی تفریق امتیاز اور معرفتہ باقی نہ رہے تو یقیناً عالم بے معنی اور لغو بھی ثابت ہو جاتا ہے اور خدا کی بے مثال صناعی و قدرت پر ایک بڑا دھبہ بھی آجاتا ہے۔ لیکن اگر اس التباس کے بجائے وہی امتیاز قائم رہے جو ہے اور جس کی وجہ سے عالم کی ہر چیز آج اپنی حد میں پہچانی جا رہی ہے تو یقیناً عالم کی تخلیق بے شمار حکمتوں کا نتیجہ اور خدا کی قدرۃ کاملہ کا ایک بیمثال نمونہ ثابت ہوگی۔

پس روشن ہوگیا کہ التباس و اختلاط ہی وہ چیز ہے جو کائنات کے وجود کو باطل کرتی ہے اور اس کے بالمقابل امتیاز و فصل ہی وہ دولت ہے کہ ہر چیز کے وجود کو ثابت اور نمایاں کرتی ہے اگر عالم میں اجناس کے اشتراک کے ساتھ فصول کا امتیاز نہ ہو تو عالم کی نہ ہر شئی لاشئے بنجائیگی

اور اس کا خیمہ درہم برہم ہو جائیگا۔

الحاصل جس دائرۂ اشتراک میں ان صوری خصوصیات اور شکلی امتیازات کا قدم پہنچ جائیگا وہیں اشیاء عالم عدم کے التباس سے نکلکر وجود کی امتیازی سطح پر آجائینگی اور اپنے اپنے مقصد تخلیق کا افادہ کرنے میں لگ جائینگی۔ گویا عالم میں افادہ و استفادہ، تعلیم و تعلم، افہام و تفہیم، لین دین رنج و خوشی۔ اور تمام وہ حالات جو ایک کے دوسرے سے متعلق ہو سکتے ہیں صرف انہی امتیازات اور خلقی تفریقوں کی بدولت پائے جا سکیں گے۔ کیونکہ جب ایک ایک اور دوسرا دوسرا رہیگا تو جب ہی وہ متعدی حالات بھی نمایاں ہو سکیں گے جو ایک کے دوسرے سے متعلق ہیں۔ ہاں اگر کائنات کی ان اشیاء میں سے جو وجود اور مادہ کے لحاظ سے بالکلیہ غیر ممتاز ہیں ان امتیازی خصوصیات اور شکلی و صوری تعینات کو اٹھا دیا جائے تو نہ جزئی جزئی رہیگی نہ کلی کلی بلکہ ساری کائنات ایک متصل واحد شئے رہکر ان اغراض و منافع کے افادات سے قطعاً محروم ہو جائیگی جو اسکے ممتاز اجزاء سے متعلق تھے۔ پس ہر ہر فرد اور ہر ایک مجموعہ پھر ہر ہر جزئی اور ایک ایک کلی انہی تکوینی خصائص کی بدولت اپنے وجود اور نمائش کو تھامے ہوئے ہے۔

فصل

دُنیا کی مختلف قومیتیں

اور اُن کے بقا و تحفظ کا راز

ٹھیک ان مادّی اور تکوینی خصوصیات کی طرح کچھ معنوی خصائص اور باطنی امتیازات بھی ہیں جنہوں نے بنی آدم میں جسمانی صورتوں کے دوش بدوش کچھ معنوی صورتیں بھی پیدا کردی ہیں، اور اسی لئے انسانوں میں کتنے ہی معنوی مجموعے یا جتھے اور قومیتیں قائم ہوگئیں۔ مسلم قوم، آرین قوم ہندو قوم۔ عیسائی اور یہودی اقوام کی قومیں ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود کس درجہ متفاوت اور مختلف ہوگئیں اور اس طرح ایک وسیع دائرۂ اشتراک میں کتنے ہی اختصاصات نمایاں ہوگئے۔

لیکن ان مختلف قوموں اور متفرق امتوں کا باہمی فصل و امتیاز بھی بہت سی قومی خصوصیات اور مخصوص آثار امتیازی پر مبنی ہے۔ جبکہ ان اقوام کے اخلاق و عادات مختلف ان کا تمدّن و تہذیب مختلف ان کے جذبات و احساسات مختلف تو یہ عادات و ملکات۔ معاشرت و تہذیب۔ جذبات و حسیات۔ طرز اعمال و افعال۔ طرز سلام و کلام اوضاع لباس اور اطوار خورد و نوش وغیرہ ہی وہ خصوصیات ہیں کہ جنکے امتیاز سے ایک قوم کا امتیاز قائم ہوسکتا اور ایک قوم بالاستقلال قوم کہلائی جاسکتی ہے۔ ہم اگر آج ایشیائی قوموں کو یورپین اقوام سے مختلف کہہ سکتے ہیں (جبکہ وہ نسل و انسانیت میں متحد ہیں) تو صرف اسیوجہ سے کہ جو خصوصیات تمدن و معاشرت اور جذبات و حسیات ایک قوم کی ہیں ان کا دوسری میں وجود نہیں اسلئے لامحالہ ایک قوم کو دوسری قوم سے ممتاز اور جدا ہی سمجھا جائیگا۔

پس جس طرح گذشتہ انفرادی نوعی اور صنفی مجموعوں کو ان کے مادّی اور تکوینی امتیازات نے ایک دوسرے سے ممتاز کردیا تھا۔ اسی طرح قومی مجموعوں کو قومی خصوصیات یعنی باطنی حسیات

دلی جذبات اور پھر جوارح کے اعمال و افعال نے باہم ممتاز بنا دیا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی حد تک قومی تخالف اور قومیتوں کے امتیاز میں ملکی و نسلی اختصاصات اور مرز و بوم کی تعینات کو بھی دخل ہو لیکن چونکہ یہ غیر اختیاری امتیازات کسی علم صحیح یا غلط پر مبنی نہ ہونے کے سبب کوئی اہمیت نہیں رکھتے اسلئے اقرار کرنا پڑے گا کہ قوموں کے فصل و امتیاز کی اساس صرف روحانی خصوصیات پر قائم ہے۔

کیونکہ یہ روحانی خصائص ہی وہ زبردست امتیازات ہیں جو بسا اوقات نسلی اور بونی بلکہ کل مادی اور ارضی امتیازات کو مقہور کر کے بلا شرکت غیرے قومی وجود کی تقویم کے کفیل و سرمایہ دار بن جاتے ہیں۔

یہی روحانی خصائص جبکہ ایک خاص ترتیب کی ساتھ عالم میں ہویدا ہوتے ہیں تو انکے مجموعہ کا نام مذہب اور دین ہو جاتا ہے اور اس طرح مختلف قومیتوں کی تعمیر انہی مذہبی خصائص کی اساس پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پس جس طرح مادیات میں تکوینی حقائق (حیوانیت، نباتیت اور جمادیت) کے ظہور کے لئے مخصوص شکلوں اور صورتوں کی ضرورت ہے، اسی طرح سلسلہ روحانیت میں شرعی اور مذہبی حقائق کے بروز کے لئے بھی فطرۃً مخصوص ہیئتوں اور ممتاز شکلوں کی حاجت ہے۔ یعنی کوئی مخصوص مذہب جب ظہور کریگا تو اپنی ہی قدرتی شکل پر نہ کہ دوسری مصنوعی اور خود ساختہ شکلوں میں۔ کیونکہ اگر اس کا پیرایۂ ظہور اصلی صورت چھوڑ کر کسی مصنوعی صورت میں آجائے تو پھر ہم اسکو وہی مذہب نہیں کہہ سکتے جو ابھی اس سے پہلے اپنی شکل میں جلوہ پیرا تھا۔

اسلامی ارکان کی شکلیں

اب تم دنیا کے سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مذہب (اسلام) پر ایک نگاہ ڈالو تو نظر آئیگا کہ روحانیت کے مشترک دائرہ میں اسکی بھی ایک خاص شکل و صورت متعین ہے اور اس کے اجزاء و اعضا کی بھی جنس کیوجہ سے وہ دوسرے مذاہب سے بالکل ممتاز و نمایاں ہے۔

اُسکے ہمہ گیر شعبوں (عقائد و تصدیقات۔ اعمال و عبادات۔ معاملات و سیاسات۔ آداب

و معاشرات۔ سلوک حالات و مقامات) میں سے کسی ایک کو لے لو ہر ایک رکن اور مامور و منہی کا ایک خاص پیرایہ نظر آئیگا۔ جسمیں ہو کر اس کی حقیقت ظہور کر رہی ہے وہ اسی پیرائے اور صورت کے ذریعہ سے اپنے جنسی اور غیر جنسی اخوات سے ممتاز اور اپنا مستقل وجود قائم کئے ہوئے ہے۔ نماز کی صورت اور ہے روزہ کی اور۔ حج کا پیرایہ ظہور اور ہے جہاد کا اور یہ ناممکن ہے کہ نماز کی حقیقت دوڑنے اور بھاگنے یا جنگ و جدل کی شکل میں نمودار ہو۔ جس طرح یہ محال ہے کہ جہاد بالسیف کی حقیقت مصلّی میں حاضر ہو کر سکون کے ساتھ رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ کرنے کی ہئیت میں ظاہر ہو حج کی حقیقت جب ظہور کرے گی تو اسی اپنے جامۂ احرام اور طواف و سعی کی فطری شکل میں نہ کہ خانہ نشینی کے ساتھ آرام سے سونے اور لیٹنے بیٹھنے کی صورت میں روزہ کا مظہر اور پیرایۂ ظہور قدرۃً متعین ہے پس اسکی حقیقت کا ظہور کبھی ہوگا تو اپنی اسی (امساک وصبر) کی صورت میں نہ کہ کھانے پینے اور لذائذ طبعی کی تحصیل کی شکل میں اسی طرح محاسن اخلاق سخاوۃ۔ شجاعۃ۔ مروۃ۔ حلم۔ حیا۔ ایثار وغیرہ اور رذائل اخلاق حسد۔ کینہ۔ طمع۔ بخل وغیرہ کی مکنون حقیقتیں جو ہر انسان کے باطن میں فطرۃً مرکوز ہیں ..... جب جوارح پر ظہور کریں گی تو یقیناً اپنی ہی شکل میں نمودار ہوں گی۔ بخل ہمیشہ مال کو روکنے اور نہ دینے کی شکل میں ظاہر ہوگا جس طرح سخاوۃ اسکو خرچ کرنے اور بذل کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ اتفاق کا مستور جذبہ قتل و غارت اور فساد و خونریزی کی شکل میں دنیا پر ظاہر ہوا ہو۔ جیسا کہ کبھی نہیں سنا گیا کہ اختلاف نے آشتی و صلح اور محبت و پیار کی صورت میں اپنی نمائش کی ہو۔

معاملات و سیاسیات کو لیلو تو ہر ایک معاملہ کی شکل قدرۃً متعین ہے۔ بیع و شرا کی حقیقت یقیناً چوری و ڈاکہ زنی کی شکل میں نہیں نمایاں ہوسکتی بلکہ اپنی ہی شکل پر آئیگی۔ نکاح و طلاق کی حقیقتیں اپنے ہی پیرائے اختیار کریں گی نہ کہ دوسری اشیاء کے۔

اسی طرح اسلامی معاشرت اور معیشت کے کل شعبے اپنی مخصوص صورتوں ہی کے سبب دوسری معاشرتوں سے ممتاز اور اپنے وجود کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہ اسلام کے جزوی شعبوں

اور ارکان واجزا کی شکلیں ہیں جنکو فطرۃ شرعیہ نے متعین کر دیا ہے۔ جب انکو ترتیب کے ساتھہ جوڑ دیا جائے تو یہ مرتب مجموعہ ہی اسلام کی مجموعی شکل ہو جائے گی۔ یعنی جسطرح ایک انسان کے اعضا، ہاتھہ۔ پیر۔ سینہ۔ کمر۔ چہرہ۔ مہرہ وغیرہ کی الگ الگ اور ممتاز شکلوں کو قدرۃ نے ترتیب کے ساتھہ جوڑ دیا۔ تو اسی انفرادی جوڑ بند سے انسان کی مجموعی ہیئۃ قائم ہو گئی۔

اسیطرح اسلام کے ان اجزا، و اعضا کی جدا جدا صورتوں کو جبکہ قدرۃ نے ایک خاص ترتیب سے پیوست فرما دیا تو اس پیوستگی ہی سے اسلام کی مجموعی ہیئۃ قائم ہو گئی۔ یہی اسلام کی مجموعی ہیئۃ و صورت جبکہ ایک انسان پر فائض ہوتی ہے تو اسکی جسمانی صورت کے دوش بدوش اسکی ایک روحانی و مذہبی شکل بھی قائم ہو جاتی ہے اس جسمانی شکل کیوجہ سے اسکو انسان کہا جاتا تھا تو اس روحانی یا اسلامی شکل کی وجہ سے اسکو مسلم پکارا جائیگا۔ اور پھر ایسے انسانوں کے مجموعہ پر جبکہ اس کے اجتماعی احکام کی صورتیں فائض ہوتی ہیں تو اس مجموعہ کو اسلامی قوم کہا جاتا ہے

پس یہ اسلام اور اسکی قومیت اسی صورت میں اسلام اور قوم اسلام پکارے جاسکتے ہیں جبکہ اپنی ہی فطری شکلوں کے ساتھہ انسانوں میں نمایاں ہوں۔ اگر یہ ان کی مخصوص شکلیں دوسرے اقوام کی قومی و مذہبی صورتوں سے ممتاز رکھی جانے کے بجائے دوسرے مذاہب کی شکلوں سے ملتبس بنا دیجائیں تو پھر ان انسانوں کو مسلم قوم اور ان کی اس مصنوعی ہیئۃ کو اسلامی شکل کے بجائے اسی ملۃ و قومیۃ کا نام دیا جائیگا جس کی شکل اسکو پہنا دی گئی ہے۔ پس یہ بات کافی روشنی میں آگئی کہ حقائق مذہب کی صورتوں کا امتیاز باقی رکھے جانے ہی سے ان کے وجود کو باقی رکھا جاسکتا ہے۔ اور یہی صور مذاہب کا امتیاز ہے جس سے ہر ایک ملۃ و قوم اپنے نام سے پکاری جاسکتی اور باقی رہ سکتی ہے۔

قومی امتیازات اور اختلاف مذاہب

پس اب یہ دعوی پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا کہ اختلاف علوم و عقائد، اختلاف شرائع و ملل نے دنیا کی متحد الحقیقت اقوام کو پراگندہ کر کے ہر ایک کے لئے ایک مابہ الامتیاز پیدا کر دیا ہے۔ اور وہ

امتیازی خصائص جو بے شمار قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں، درحقیقت مذاہب مختلفہ کے عقائد و اعمال میں پنہاں ہیں۔ اگر تمام شرائع۔ تمام ملتیں۔ اور تمام ادیان عالم ایک ہی نقطۂ علم وعمل کی خبر دیتے اور یہ اخلاقی خصوصیات ان میں باقی نہ رہتیں تو پھر یقیناً وہ ادیان نہ کہلاتے بلکہ دین واحد وہ شرائع نہ کہلاتیں بلکہ ایک شریعت۔ انکو ملل نہ کہا جاتا بلکہ ملتِ واحدہ اور اسلئے قومیتیں مختلف نہوتیں بلکہ امتہ واحدہ عالم کی وارث بنجاتی۔

پس قومیت یا قوم درحقیقت اس انسانی مجموعہ کا نام ہے جو کسی خاص ملتہ، خاص مشرب یا خاص سبیل و صراط کا پابند ہو۔ اور اس مشرب و ملتہ کی خصوصیات نے (خواہ اعتقادی ہوں یا عملی) اس مجموعہ کو دوسرے انسانی مجموعوں سے الگ اور ممتاز کر دیا ہو۔ اگر قومیتوں کا یہ مابہ الامتیاز اٹھا یا جائے یعنی خصوصیات فنا کردیجائیں یا ملتیں اور مشتبہ ہوجائیں تو ظاہر ہے کہ کوئی قوم اور کوئی ملتہ اپنے نام سے باقی نہیں رہ سکیگی۔

پس جس طرح ایک عیسائی اپنی خصوصیات مذہب کے دائرہ میں ایک یہودی اور بت پرست سے ممتاز ہے۔ ایک یہودی اپنے خصائص ملتہ کے ذریعہ ایک نصرانی اور وثنی سے علیحدہ ہے۔ ایک بت پرست اپنے مخصوص مشرکانہ حرکات کے سبب سے ایک عیسائی اور پارسی سے جدا ہے۔ اسی طرح ایک اسلامی فرد یا ایک مسلم حنیف اپنی خصوصیات علم و عمل اپنے مخصوص ہی عقائد و اعمال اور اپنی ممتاز شریعت الٰہی پر دل سے یقین رکھنے اور جوارح سے عمل کرنے کی بدولت ہی ایک نصرانی و یہودی ایک وثنی و پارسی اور اک ملحد و زندیق سے اسی طرح ممتاز ہے جسطرح بینا نابینا سے۔ نور ظلمت سے۔ سرکتی ہوئی دھوپ سایہ سے۔ اور زندہ مردہ سے۔ پس جبتک بینا کی خصوصیات بینا میں ہیں وہ نابینا نہیں ہوسکتا۔ جبتک نور کی خصوصیات نور میں ہیں وہ ظلمت نہیں بن سکتا۔ جبتک دھوپ کی خصوصیات میں دھوپ میں ہیں وہ سایہ نہیں ہوسکتا۔ اور جبتک زندہ کی خصوصیات زندہ میں ہیں وہ مردہ نہیں ہوسکتا۔ وما یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء

ولا الاموات۔

اور اسی طرح جبتک ایک مسلم کی خصوصیات اسلامی مسلم میں ہیں وہ کافر نہیں ہو سکتا۔ اور جبتک قوم اسلام کی مجموعی خصائص وعلائم قوم میں ہیں وہ قوم ضرور ہر قوم سے ممتاز رہیگی۔

بالآخر ہم بصیرۃ کی ساتھہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ خصوصیات مذاہب خصوصیات اقوام پیدا ہوتی ہیں اور انہی خصوصیات و شکل کا باقی رہنا مذہب و قوم کا باقی رہنا۔ پھر انہی خصوصیات اور صورتوں یا پیرایوں کا مشتبہ ہونا یا مختلط اور مشتبہ ہو جانا قوم و مذہب کا تباہ ہو جانا ہے۔

اسی تشریعی پیرایہ اور اختلاط و التباس کو خواہ وہ عقائد میں نمایاں ہو یا اعمال میں ہم تشبہ بالغیر کہتے ہیں۔ اور کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ عقدۂ تشبہ و تلبیس حق باطل ہے کہ جب کبھی مذاہب کے سلسلہ میں یہ گرہ پڑگئی ہے تو وہ رشتۂ مذہب پھر نہ سلجھ سکا اور آخر کار تشبہ کے ہاتھوں مٹ گیا ہے۔ اور اس طرح بڑی بڑی قوموں اور مذاہب عظیمہ کی تباہی کا بار اسی تشبہ اور تلبیس کی گردن پر ہے۔

اسی تشبہ نے آج سے کتنی ہی صدی پیشتر دین ابراہیمی حنیفیہ و اسلام کی روشنی سے ریگزار عرب کو محروم کیا۔ اور عربی قوم کی حقیقی عزت کو مٹا دیا تھا یعنی عمرو بن لحی بن قمعہ ابن خندف (ایک سردار عرب) نے شام کا سفر کیا اور بلقاء پہنچکر شامیوں کو بت پرستی کا گرویدہ دیکھا۔ شیطان نے یہ شیطانی رسم اسکے سامنے بڑی مزین بناکر پیش کی اور اس نے حجاز واپس ہو کر شامیوں کی نقل بیت اللہ میں رسم بت پرستی کی بنیاد ڈالی۔ اور جب بیت اللہ اور بلد حرام میں شرک کے قدم جمگئے تو عرب کی ساری آبادی نے جو اہل حرم کی مقلد تھی سرگرمی سے اس ملعون رسم کا استقبال کیا یہانتک کہ اس تشبہ بالمشرکین کی بدولت سارے عرب میں کفر و شرک کے جراثیم پھیل گئے اور ملک تمام دین حنیف کی روشنی سے محروم ہو گیا۔

اسی لئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تشبہ اول کے بانی عمرو بن لحی کی نسبت ارشاد فرمایا کہ

رأیت عمرو بن لحی بن قمعۃ بن خندف ... ... عمرو بن لحی کو

یجر قصبہ فی النار۔ دیکھا کہ وہ جہنم میں اپنی انتڑیاں کھینچتا پھر رہا ہے۔

پس اب دیکھ لو کہ دین حنیف کا جاہلیت ہو جانا اور ایک موحد قوم کا مشرک بنجانا جو ایک عظیم الشان انقلاب ہے تشبہ بالغیر کی بدولت کیسی سہولت سے رونما ہو گیا اور اس تشبہ بالاقوام نے کس طرح ایک مذہب کو مٹا کر دوسرا مذہب اور ایک ممتاز قومیت کو فنا کر کے دوسری نوع کی قومیت قائم کر دی۔

پھر اس صدیوں کے پرانے قصہ کو چھوڑ کر قرون رواں ہی کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈال لو تو روشن ہو جائیگا کہ اسی تشبہ بالغیر نے ٹرکی کی شہری آبادی سے کیسے غیر محسوس طریقہ پر اسلامی خصوصیات اچکنی شروع کیں اور یورپ کی اس کورانہ تقلید یا تشبہ بالنصاریٰ کے اس عملی اقدام نے ٹرکی کے متمدنوں کو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ نہ آج انھیں اسلامی مسائل سے کوئی دلچسپی ہی رہی اور نہ مسلمان کہلانا ہی ان کے نزدیک کوئی قابل وقعت حالت سمجھی جا رہی ہے اور ع

بہ بیں است کزیں میان چہ برخواہد خواست

پھر آج اسی تشبہ بالنصاریٰ کے جذبات نے کابل کے متمدن حصہ کو زیروزبر کیا اور اسلامی شعائر محو کر دینے کی تمہید ڈالدی اگر ان آزاد اور بے راہ جذبات میں مذہب مزاحمت نہ کرے۔ تو اس زمانہ کا بہت جلد انتظار کرنا چاہیئے کہ اس خالص اسلامی ملک سے اسلامی خصوصیات ایک ایک کر کے رخصت ہو جائیں نعوذ باللہ۔

پس یہ تشبہ بالغیر ہی وہ ہے کہ اسکے جراثیم جس قومی اور ملی وجود میں پڑ گئے ہیں۔ وہ قوم و ملت کبھی نہیں پنپ سکی اور آخرکار فنا ہو کر رہی۔

تشبہ کے ان تاریخی انقلابات اور اسکی طبعی رفتار کو دیکھتے ہوئے اب اسکی حقیقت ان مختصر الفاظ میں لائی جا سکتی ہے کہ تشبہ بالغیر فی الحقیقت تخریب حدود۔ اور ابطال ذاتیات کا نام ہے یعنی فطری حدود سے تجاوز کرنے یا حقیقی حدود کو توڑ دینے کا دوسرا نام تشبہ بالغیر ہے جب غیر کی ساتھ مشابہت بڑھیگی تو بلاشبہ اصلی شکل میں فرق آجائیگا یہانتک کہ بالآخر اس تخریب

کے ذریعہ اصلی اور فطری شکل محو ہو جائیگی۔ اور ایک غیر فطری شکل نمایاں ہو جائیگی۔ کیونکہ یہ تخریب خواہ کسی تکوینی محدود میں واقع ہو یا تشریعی محدود میں۔ جب کسی چیز کی حدود ہی باطل ہو جائیں تو محدود کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ فرض کیجئے کہ انسانی حقیقت کی حدود جنہیں محدود رہکر وہ انسان ہے "حیاۃ" اور "ادراک" ہیں۔ حیاۃ کے دائرہ میں رہکر وہ حساس بھی ہے اور اسلئے وہ جماد نہیں۔ اسی دائرہ میں وہ حرکت ارادی بھی رکھتا ہے اور اسلئے جامد پتھروں کی طرح ساکن نہیں ہے پھر اسی حد کے اندر وہ نشو ونما کی طاقت بھی رکھتا ہے اور اسلئے وہ کوئی چوب خشک نہیں بلکہ بالیدگی تا ہوئی ہے۔ پس حیوانیت اس کی حقیقت کے لئے ایک حد ہے ایک کنارہ ہے جسکی روک تھام نے اسکو جمادات میں داخل ہونے سے بچالیا اور الگ کر دیا ہے۔ پھر اسکی حقیقت کیلئے دوسرا کنارہ "نطق و ادراک" ہے جس کے دائرہ میں رہکر وہ معقولات کا احساس بھی کرتا ہے۔ وہ نطیق و بلیغ بھی ہے۔ وہ متمدن بھی ہے، وہ سلیقہ مند اور عصمت شعار بھی ہے۔ پھر نہ نئے اختراعات و ایجادات سے اپنے تمام ابنائے جنس پر فوقیت رکھتا ہے اور ان سے ممتاز بھی ہے۔ اس دوسری حد ہی نے اسکو گدھا اور گھوڑا اور تمام لایعقل حیوانات سے الگ کر دیا ہے۔ پس وہ اپنی انسانیت کو انہی دو دائروں میں رہکر برقرار رکھ سکتا ہے۔

اگر بالفرض اسکی حیوانیت یا حیاۃ کی حد توڑ دیجائے اور اس شکستہ کنارہ سے موت کی کیفیات اس میں سرایت کر جائیں تو بلاشبہ ایک ذی ارادہ انسان بے جان ہو کر جمادات میں شامل ہو جائیگا۔ اور اسوقت اسمیں نمو کے بجائے جمود، حرکت ارادی کے بجائے اضطراری سکون اور حس کے بجائے بے حسی کی کیفیات نفوذ کر جائینگی۔ اور اسوقت اس کو محض مجازاً ہی انسان کہہ سکیں گے۔ اور اگر حیاۃ کی حد باقی رہے لیکن فہم و ادراک کا کنارہ ٹوٹ جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ جاندار ہے لیکن ادراک کا کنارہ ٹوٹ جانے سے اس میں علم کے بجائے جہالت عقل کے بجائے غفلت۔ عصمت و عفت کے بجائے سبعیت و بہیمیت کے رذائل داخل ہو جائینگے اور جب اسکی اندرونی یا ذاتی اشیا نکل جائینگی تو لامحالہ ان کے بجائے بیرونی چیزیں داخل

ہو کر اسکی حقیقی انسانیت کو فنا کر دیں گی۔ کیونکہ کسی چیز کی حد ٹوٹ جانے کی یہی حقیقت ہو سکتی ہے
کہ نہ وہ اپنے محدود کی ذاتی اجسام کے لئے جامع رہے اور نہ غیر اشیاء کے داخل کرنے سے مانع
پس جس طرح یہ ایک نہایت ہی رفیع المنزلت تکوینی مجسمہ (انسان) اس تکوینی تشبہ اور
خارج از انسانیت اشیاء کے اختلاط سے اپنی حقیقی انسانیت کو کھو بیٹھا اسی طرح سلسلہ تشریعی میں بھی
اقوام اور انسانی مجموعے بھی جبکہ خارجی اشیاء کو اپنے اندر داخل کر لینے سے مانع نہیں ہوتے تو
وہ یقیناً اپنی ذاتی خصوصیات کے لئے جامع بھی نہیں رہتے اور اس عدم منع و جمع کے سبب انکی
حقیقی قومیت بھی پامال اور اختلاط و التباس علم امتیاز کے سبب سے معدوم ہو جاتی ہے۔ پس کسی
قوم کے اپنی اصلی حدود پر باقی رہنے اور دوسری اقوام میں مدغم نہ ہونے کی صورت یہی یہ ہے کہ وہ
اس تشبہ یا تخریب حدود یا ابطال ذاتیات یا فساد حقائق کے ہلاکت انگیز دائرہ سے بچائی جائے

(ا) یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلام نے ان عورتوں پر لعنت کی جو مردوں سے اوضاع و اطوار
میں تشبہ کرتی ہیں۔ پھر اسی طرح ان مردوں پر جو تشبہ بالنساء کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر دو صنف کی حدود
الگ الگ اور ہر ایک سے اغراض۔۔۔ جدا جدا متعلق ہیں اور جبکہ ایک صنف دوسری سے مشابہت
پیدا کر رہی ہے تو گویا اپنی حدود کو توڑ کر دوسرے کی حدود میں قدم رکھ رہی ہے اور ان منافع و
مقاصد کو باطل کرنا چاہتی ہے جو اسکی اسی صنفی صورت سے متعلق تھے کہ بسبب التباس کے سبب
متشبہ صنف کی فطری شکل مٹیگی تو اس سے متعلقہ اغراض بھی فنا ہو جائینگی۔ دیکھو آج یورپ کی متمدن
دنیا کی معیشتہ منزلی کا سب سے زیادہ گہرا مرض یہی اختلاط و التباس ہے۔ مغرب کی ایک عورت جو
تمام عورتوں کی طرح نوع انسانی کی تکثیر و تربیت کے لئے تھی۔ جو قلوب کے سکون اور روحوں
کی مودۃ کے لئے تھی اور جو ایک سلیقہ شعار ماں اور ایک عفتہ آثار بیوی بننے کے لئے پیدا کی گئی
تھی اور جو اسلئے تھی کہ گھر کی چہار دیواری کو اس سے زینت ہو اور نظام خانہ داری اسکے دست
و بازو کی حرکت پر قائم رہے آج وہ گھر کا میدان چھوڑ کر جبکہ مردانہ لباس میں کارخانوں تجارت
گاہوں اور ٹکٹ گھروں میں مزدوری تلاش کرنے لگی۔ سڑکوں اور تفریح گاہوں کیلئے

الڈ رونق بننے لگی۔ اسکولوں اور کالجوں میں مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہوگئی۔ تو انصاف سے بتلاؤ کہ کیا وہی عورت رہی جسکو نسائیت کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ کیا اسمیں سے نسوانی خصائص نکلکر کتنے ہی مردانہ خصائل اسمین حلول نہیں کر گئے؟ اور جب ایسا ہوا تو وہ نہ خالص عورت ہی رہی اور نہ بالکل مرد ہی بن سکی۔ بلکہ وہ ایک تیسری جنس ہوگئی جسکو خدا کی فطرۃ نے نہیں بلکہ انسان کی گمراہی نے پردۂ دنیا پر لا کھڑا کیا ہے؟ چنانچہ دیکھلو کہ اس تیسری قسم کی عورت کے نہ وہ جذبات ہی رہے۔ جو عورتوں کے لئے قدرۃ نے صنفی حیثیت سے رکھے تھے نہ انکے وہ فرائض ہی رہے جن کے لئے انکی تخلیق کی گئی تھی۔ اسکے محسوسات بدلگئے۔ خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ اب نہ اس کا عورتوں کا سا چہرہ ہے۔ نہ عورتوں کا سا دل اور وہ اپنے قلب وقالب کو چھوڑ کر کسی دوسرے جون میں آگئی ہے جو نہ عورت کا ہے نہ مرد کا۔ گویا فطرۃ نے مرد اور عورت کو دو جنس قرار دینے اور ان میں ہر اعتبار سے تفریق وامتیاز رکھنے میں (معاذ اللہ) سخت غلطی کی تھی جسکی اصلاح آج یورپ کے مدبروں نے حریۃ ومساوات کے نام سے کی۔ یہ جنون اور قوالب وقلوب کا بدل جانا یقیناً اسی حد بندی کے توڑ دینے کا نتیجہ ہے جس کی روک تھام ترک تشبہ نے کی تھی اور بتلایا تھا کہ یہ اختلاط والتباس اگرچہ ملحدوں کی زبانوں سے حریۃ ومساواۃ کا لقب پائے پر اسلام کے نزدیک وہ ایک لعنت اور تخریب وجود شئے ہے۔

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت تشدد آمیز لہجہ میں اس تشبہ نسائی کا دروازہ بند فرمایا اور اسپر لعنت فرمائی ہے۔

لعن اللہ الرجل یلبس لبسۃ المرأۃ والمرأۃ تلبس لبسۃ الرجل (وفی روایۃ) لیس منا من تشبہ بالرجال من النساء ولا من تشبہ بالنساء من الرجال (ابوداؤد)	خدا کی لعنت ہے اس مرد پر جو عورتوں کا سا لباس پہنے اور اس عورت پر جو مردوں کا سا لباس پہنے۔ (اور ایک روایۃ میں ہے) وہ مرد ہم میں سے نہیں جو عورتوں سے تشبہ کرے اور نہ وہ عورت ہم میں سے ہے جو مردوں سے تشبہ کرے۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ شریعت نے مصوّر و پر لعنت کی کیونکہ ایک مصوّر تصویر کشی اور بُت گری کے وقت گویا اپنی مخلوقیت کی حدود کو توڑ کر حد خالقیت میں قدم رکھنا چاہتا ہے - اور دونوں حدود کو مشتبہ اور ملتبس بنا دینا چاہ رہا ہے - حدیث شریف میں ارشاد ہے -

اِنَّ اصحاب هذه الصور ليعذبون يوم القيمة يقال لهم احيوا ما خلقتم (وفي رواية) ان اشد الناس عذابا يوم القيمة الذين يضاهون بخلق الله (صحيحين)

یہ تصویر کش لوگ قیامت کے دن عذاب دیے جائیں گے کہا جائیگا کہ اس اپنی مخلوق (تصاویر) میں جان ڈالو (اور ایک روایۃ میں ہے) سب سے زیادہ شدید عذاب قیامۃ کے دن ان لوگوں پر ہوگا جو اللہ کی صفت خلق سے تشبّہ کرتے ہیں (گویا خالق بننا چاہتے ہیں) -

(۳) یہی وجہ ہے کہ ایک صنف رجال ہی میں باہم بوڑھوں کا جوانوں سے تشبّہ کرنا مثلاً اپنے شیب (سفید بالوں کا اکھاڑنا) جوانوں کے سے شوخ لباس پہننا انکی سی شوخی و آزادی برتنا اُن کیطرح لہو ولعب میں وقت گذارنا شرعاً ناپسندیدہ قرار پایا کیونکہ یہ حد شیخت کو (جس سے خاص اغراض متعلق تھیں) توڑ کر حد شباب میں قدم رکھنا ہے اور گویا خیر سے شر کیطرف آنا ہے - ہاں اگر جوان بوڑھوں سے تشبّہ کریں تو ادنیٰ سے اعلیٰ کیطرف بڑھنا ہے - پس یہ تشبّہ ایسا ہوگا جیسی ایک فاسق کسی صلح کے ساتھ تشبّہ کرکے حد فسق کو توڑ ڈالے - یا کوئی کافر مسلم سے تشبّہ کرکے حدود کفر کو توڑ دے اور حدود اسلام میں آجائے - اور ظاہر ہے کہ یہ تشبّہ بالخیر مطلوب ہے - حدیث میں ارشاد فرمایا گیا -

خير شبابكم من تشبه بكهولكم و شر كهولكم من تشبه بشبابكم (كنز العمال صفحہ ۱۲۹ ج ۸) -

تمہارے نوجوانوں میں بہترین جوان وہ ہے جو بوڑھوں سے مشابہت اختیار کرے اور تمہارے بوڑھوں میں بدترین بوڑھا وہ ہے جو جوانوں سے تشبّہ کرے -

(۴) اور پھر یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسکو بھی ناپسند کیا تھا - کہ غلام کبھی آزادوں سے تشبّہ اختیار کرے یا باندی آزاد عورتوں میں باعتبار وضع کے ایسی ملجائے کہ حُرّہ اور امۃ میں

امتیاز و معرفت ہو سکے۔ فاروق اعظمؓ نے دفار کو ڈانٹا اور فرمایا۔

القی عنک الخمار یا دفار اتتشبہین بالحرائر | اے دفار اس اوڑھنی کو پھینک۔ کیا تو آزاد عورتوں سے تشبہ کرتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ قدرۃ نے ہر صنف ہر نوع ہر جماعت اور ہر قوم کو جدا جدا وجود بخشا ہے۔ جس طرح خدائے برحق نے تکوینیات میں ہر ہر ذرّہ کو مخصوص حدود عطا کیں اور خاص شکل دی جس سے وہ پہچانا اور پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح سلسلہ تشریع و تدین میں ہر ہر قوم بلکہ تمام ان مسلم طبقوں کو بھی کچھ امتیازی حدود عطا کی ہیں جو اپنی شرعی خصوصیات سے کوئی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ تاکہ ہر طبقہ اور جماعت کے مخصوص اغراض و منافع قائم رکھے جا سکیں۔

ظاہر ہے کہ بوڑھے کا جوان سے زن و مرد کا ایک دوسرے سے اور غلام کا آزاد سے تشبہ کرنا ایک مسلم کا مسلم سے تشبہ کرنا ہے لیکن شریعت اس تشبہ کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی وہ نہیں چاہتی کہ ان اسلامی اصناف کی حدود ٹوٹ کر باہمی امتیاز کے بجائے کوئی التباس پیدا ہو جائے۔ جس سے معرفت و پہچان مٹ جائے اور وہ اغراض فوت ہو جائیں جو ان اصناف سے جدا جدا مطلوب تھیں۔

پس جو شریعت اپنے حلقہ بگوشوں کے متفاوت طبقات میں بھی اس مخرّب حدود تشبہ کو پسند نہیں کرتی کیا وہی شریعت اسے پسند کرے گی۔ کہ ایک مسلم کافر سے تشبہ کرے۔ ایک محبّ خدا عدو اللہ سے مشابہت پیدا کرے۔ ایک مطیع سرکش سے جا ملے۔ ایک حقانی حدود والا پاک حدود کو توڑے اور باطل حدود کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ کیا کسی درجہ میں بھی یہ عمل خیر و سعادۃ کے لئے جائز بن سکتا ہے؟ کیا بھلائی کا کوئی شمہ حیا کا کوئی شائبہ۔ غیرت کا کوئی ادنیٰ جزو اور دینی شرم کا کوئی تھوڑا سا بھی پاس اگر فی الواقع کسی میں موجود ہے اسکی اجازت دے گا کہ ہم ایک طرف اپنی زبان سے محبت الٰہی اور مسلم ہونے کا دعوٰی کریں اور دوسری طرف اپنے ہی ہاتھوں اسکی حدود پر تیشہ لیکر کھڑے ہوں۔ ان کو مٹائیں ان کے حکیمانہ اغراض و منافع کو باطل کریں اور ان کی جگہ غیر اسلامی حدود قائم کر دیں۔ تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ ورع

فصل

تشبہ کا روایتی اور نقلی نقشہ

قرآن جیسی مدعی اتحاد و ایتلاف کتاب نے بھی (جس نے سارے عالم کو ایک ہی رشتہ اخوۃ و مذہب میں منسلک کرنا اپنا واحد مقصد بتلایا اور وحدۃ توحید کا ساری دنیا کو سبق دیا) اس اختلاف صور اور امتیاز مذاہب و اقوام کو (جبتک وہ مذاہب و اقوام ہیں) قائم رکھنے کی سعی کی ہے تاکہ ہر قوم اپنی اپنی حدود میں پہچانی جاسکے۔ اس نے ایک طرف تو سارے انسانوں کو للکارا کہ ولا تفرقوا (اے لوگو متفرق مت ہو) اور دوسری طرف اپنا ہی نام فرقان رکھا کہ وہ حق و باطل میں تفریق کردیتی ہے۔ ایک طرف تو اس نے ساری دنیا کو وصل و ملاپ کی تعلیم دی اور دوسری طرف اپنا ہی نام قول فصل رکھا کہ وہ حق و باطل میں جدائی پیدا کردیتی ہے۔

چنانچہ اس فارق و فاصل کلام نے نازل ہوکر سلسلۂ تشریع میں اسلام کو کفر سے امانت کو خیانت سے اور دین حق کو تمام ادیان باطلہ سے بالکل جدا اور نمایاں کردیا۔

اُمتوں پر خالق و مخلوق کا فرق ملتبس ہوچکا تھا کسی نے خدا کی مخصوص صفات بندوں میں مان لی تھیں اور کسی نے بندوں کی ناقص صفات خدا میں تسلیم کرلی تھیں۔ اس فاصل کلام نے تمام مشرکانہ جال توڑ کر توحید کو شرک سے اس طرح الگ کردیا کہ ان میں کوئی التباس نہ رہا۔ معروف و منکر کی حدود مل گئی تھیں اُمتوں نے معروف کو منکر اور منکر کو معروف گمان کرلیا تھا۔ اس فرقان و فصل نے معروف کی حدود متعین کرکے اسکو منکر سے جدا کردیا۔ معروف کا تو امر کیا، اور منکر سے نہی کی۔

طیب و خبیث کا فرق اُمتیں بھلاچکی تھیں۔ اسی کلام فاصل نے ان میں تفریق کردی طیبات کو حلال کیا اور خبائث کو حرام کیا، پھر اسی فرقان اور قول فصل نے جہاں اسلام

وکفر۔ معروف ومنکر۔ طیب وخبیث۔ حلال وحرام اور حق وباطل میں تفریق کی تو اس کے ساتھ ہی ان اقوام میں بھی دنیوی واخروی تمیز وتفریق پیدا کردی جو ان متضاد صفات کے اعتبار سے خیر وشر کی دو جانبوں میں بٹ گئی تھیں۔ تاکہ سعید وشقی۔ نیک وبد۔ مطیع وسرکش۔ مسلم وکافر اور اولیاء رحمن واولیاء شیطان میں باہم کوئی تلبیس واختلاط راہ نہ پائے، کہیں تو اس کتاب مبین نے کہا۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین ۔	کیا ہم مسلمین کو مجرمین کی طرح کردیں گے۔

کہیں فرمایا کہ مؤمن ومفسد دو جدا جدا نوعیں ہیں جنہیں کوئی التباس نہیں ہے۔

ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ۔	آیا ہم ایمان اور نیکیاں لانیوالوں کو انکی برابر کردینگے جو زمین میں فساد کرنیوالے ہیں۔ یا ہم متقیوں کو فاسقوں جیسا کردیں گے۔؟

کہیں نیک اور بد کی تفریق بیان کی کہ ان کی موت اور زندگی سب الگ الگ ہونی چاہیے۔

ام حسب الذین اجترحوا السیئات ان نجعلهم کالذین آمنوا وعملوا الصالحات سواء محیاهم ومماتهم ساء ما یحکمون ۔	یہ لوگ جو بُرے بُرے کام کرتے ہیں کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انکو ان لوگوں کی برابر کردیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہوجائے یہ بُرا حکم لگاتے ہیں۔

کہیں فرمایا کہ نیک کردار اور بدکردار آپس میں ایسے ممتاز ہیں جیسے سوانکھا اور اندھا پس ایک دوسرے کی برابر نہیں ہوسکتا۔

وما یستوی الاعمی والبصیر والذین آمنوا وعملوا الصالحات ولا المسیء قلیلا ما تتذکرون ۔	اور بینا نابینا اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور بدکار باہم برابر نہیں ہوتے۔ تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو۔

کہیں ارشاد فرمایا کہ عبد مشترک اور عبد غیر مشترک جبکہ دو جُدا گانہ نوعیں ہیں تو وہ ایک کیسے ہو سکتی ہیں؟

ضرب اللہ مثلاً رجلاً فیہ شرکاء متشاکسون ورجلاً سلماً لرجل هل یستویان مثلاً ۔

اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہو جسمیں کئی ساجھی ہیں جنہیں باہم ضدا ضدی ہو اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا ہو کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہے؟

کہیں فرمایا کہ ایک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا انسان ایک بااختیار آدمی کی برابر کیسے ہو سکتا ہے۔؟

ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً لا یقدر علی شیء ومن رزقناہ منا رزقاً حسناً فهو ینفق منه سراً وجهراً هل یستون ؟

اللہ تعالے ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ ایک غلام ہے مملوک کہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور ایک شخص ہے جسکو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں ؟۔

کہیں فرمایا کہ ایک اپاہج کسی مستقیم الحال کی برابری کیسے کر سکتا ہے۔

ضرب اللہ مثلاً رجلین احدهما ابکم لا یقدر علی شیء وهو کل علی مولاہ اینما یوجه لا یأت بخیر هل یستوی هو ومن یأمر بالعدل وهو علی صراط مستقیم

اور اللہ تعالے ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ دو شخص ہیں جنمیں ایک تو گونگا ہو کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر ایک وبال جان ہو وہ اسکو جہاں بھیجتا ہو کوئی کام درست کرکے نہیں لاتا کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو اور خود ہی معتدل طریقہ پر ہو؟

پھر اس فاضل قرآن نے تشریعی امر بھی فرمایا تو یہ کہ اے بندگان الہی جبکہ ان تکوینیات کیطرح سلسلۂ تشریعیات میں دو متضاد چیزوں (حق و باطل) میں فطرۃً اشتی اور یکجہتی ناممکن ہو تو اسی فطرۃ کا اقتضا یہ ہو کہ تم اپنے اختیار سے بھی حق اور باطل کو الگ الگ ہی رکھو اور ان میں اس مہلک اختلاط (تشبہ) کو جنمیں مت ڈالو۔

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون ۔

حق کو باطل میں مت ملاؤ۔ اور جانتے بوجھتے حق کو مت چھپاؤ۔

پس قرآن باوجود داعی اتحاد ہونے کے ادیان واہل ادیان میں تفریق و امتیاز ہی کا حامی ہے۔

اس کا مطلب اتحاد وحدت یہ ہے کہ ساری ملتیں مٹکر اسلام میں مدغم ہوجائیں تمام ادیان جنکو اس کتاب نے منسوخ کردیا اپنے وجود کو چھوڑکر اسلام میں آلیں اور اسطرح امتیں نہ رہیں بلکہ ایک امۃ اور ادیان نہ رہیں بلکہ دین واحد ہوجائے لیکون الدین کلہ للہ۔ وہ ایسا اتحاد نہیں چاہتی کہ برائی اپنی صورت پر قائم رہتے ہوئے نیکی کے ساتھ رلجائے ظلمۃ اپنی روسیاہی سمیت نور میں آکر ملتبس ہوجائے اور اسطرح نہ حقیقی نیکی رہے نہ بدی نہ ظلمت رہے نہ نور بلکہ کوئی اور تیسری چیز تیار ہوجائے۔ اگر قرآن ایسے اتحاد کو گوارہ کرتا جو التباس حق بالباطل سے نمایاں ہو تو وہ یقیناً اسے بھی گوارہ کرتا کہ نہ قرآن رہے نہ قرآنی امۃ نہ اسلام حقیقی کی دعوت رہے نہ امۃ اسلامی کیونکہ ہم ثابت کرچکے ہیں کہ التباس ہی وہ تاریکی ہے کہ جسمیں ہر شے کا اصلی وجود پہلے چھپتا اور پھر باطل ہوجاتا ہے۔

پس یہ مخرب التباس اگر علم حقانی میں راہ پالیتا ہے تو علمی حق و باطل سے امتیاز اٹھا دیتا ہے اور جبکہ عمل حق میں قدم رکھتا ہے تو عمل ثابت کی واقعی خصوصیات مٹاکر باطل کے ساتھ اسکو رلا دیتا ہے۔ اور اس طرح ہر ایک علمی اور عملی قوم انجام کار اس علم و عمل کے اختلاط اور امتیاز شکن تلبیس سے اپنے قومی وجود کو چھوڑ دیتی اور فنا ہوکر اسی دوسری قوم میں مدغم ہوجاتی ہے۔ جس کے علمی و عملی شعائر سے اس نے اپنے علم و عمل کو مخلوط کرلیا تھا من تشبہ بقوم فھو منھم۔

پس ہر صداقت کے مٹنے کا پہلا قدم التباس واختلاط اور تشبہ ہی ہے اسی لئے آیۃ مزینہ بالا میں پہلے تلبیس کی ممانعت کی گئی ہے اور پھر گویا اس تلبیس کا اثر بصورت نہی ظاہر کیا گیا ہے جو کتمان ہے کہ اس کی ساتھ ہی حق کی روشنی چھپنے لگتی اور باطل کی تاریکی ابھر آتی ہے۔

پس قرآن کریم نے ایک طرف تو متعدد امثلہ سے تلبیس اور تسویۂ حق و باطل کے متعلق اپنی مرضی ظاہر فرمائی پھر امر اور حکم کے ذریعہ تلبیس کی ممانعت فرمائی۔ اور پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ متعدد آیات میں قطع تلبیس کا ایک عملی پروگرام بھی پیش فرمایا جسمیں صرف تشبہ ہی سے نہیں بلکہ بطور سد ذرائع ہر اس حرکت سے روکا ہے جو تشبہ تک منجر ہو تاکہ مسلم کا فریق کوئی

صوری یا باطنی اشتراک کوئی مناسبت اور کوئی مشابہت بھی پیدا ہونے پائے۔

ترک موالاۃ

اس نے حکم دیا کہ کوئی مسلم کسی کافر کے ساتھ موالاۃ و مودۃ اور قلبی حُب کا تعلق نہ رکھے کیونکہ جب قلب اقلیم تن کا سلطان ہے تو قلبی تعلقات ہی آخر کار انسان کے نیتہ وارادہ اور افعال پر بھی چھا جائینگے۔ اور اس طرح ایک مسلم قلباً و قالباً کفار سے ملتبس اور متشبہ ہو جائیگا۔ حالانکہ التباس و مشابہت قرآنی مرضیات کے صراحۃً خلاف ہے۔ پس ایک جگہ تو اس نے یہود و نصاریٰ سے ترک موالاۃ کا حکم دیا کہ۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء۔	اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا۔

پھر اہل کتاب اور عام اہل کفر اور پھر ان لوگوں سے بھی یہ رشتہ موالاۃ منقطع کر دینے کا حکم دیا جو مسائل دین کی ساتھہ تمسخر اور استہزا سے پیش آتے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزواً ولعباً من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء۔ واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین	اے ایمان والو جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب ملچکی ہی جو ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہاری دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہی انکو اور دوسرے کفار کو دوست مت بناؤ۔ اور اللہ سی ڈرو اگر تم ایماندار

پھر ایک جگہ فرمایا کہ کافر تو کافر ایک مسلمان تو کسی ایسے آدمی سے بھی رتی برابر محبت نہیں رکھ سکتا جو اللہ و رسول کے برخلاف ہو خواہ کفر کرکے ہو خواہ علانیہ فسق اور ابتداع کا ارتکاب کرکے۔

لا تجد قوماً یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ و رسولہ ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ	جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ انکو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ ورسول کے برخلاف ہیں گو وہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہو؟ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالے نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ اگر کسی اسلامی دل میں موالاۃ کفار اور محبت منکرین کا کوئی شائبہ موجود ہے۔

تو ماننا پڑیگا کہ اسی درجہ میں اسلامی عظمت و محبت کی کمی بھی اس قلب میں جاگزیں ہے ۔ ورنہ پھر اسلام وکفر کا تضاد ہی باقی نہیں رہ سکتا اسی حقیقت کو سمجھکر ارباب حقیقت نے دعویٰ کیا ہے کہ مودۃ کفار سے ایمان میں فساد آجاتا ہے ۔ بلکہ سہل ابن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ تو یہانتک کہتے ہیں کہ جس کا ایمان وتوحید خالص ہے وہ کسی مبتدع سے بھی اُنس نہیں رکھ سکتا چہ جائیکہ کفار سے اور وہ بھی مودۃ ومحبت کی شکل میں ؟ اور امام مالک رحمۃ اللہ نے اسی آیت سے قدریہ کی معاداۃ اور ان سے ترک مجالست پر استدلال کیا ہے ۔ اگر مُسلم قلوب میں سے کفار کیجانب سے یہ شدۃ وتغلیظ نکلجائے تو ضرور ہے کہ اس کی جگہ موالاۃ ومحبت لے لیگی اور قلبی محبت قائم کرنیکے بعد وہ دن دُور نہیں رہتا کہ یہ مسلم فرد انجام کار اُسی گروہ کفر میں جاملے اور صورۃ وسیرۃ سے ان کا ہم آہنگ بنجائے ۔

قرآن کریم نے اسی ترک موالاۃ کی آیت میں موالاۃ کا یہ نتیجہ بھی بیان فرمادیا ہے کہ ۔

ومن یتولھم منکم فانہ منھم ان اللہ لا یھدی القوم الظٰلمین ۔	اور جو شخص تم میں سے انکی ساتھہ دوستی کریگا بیشک وہ انہی میں سے ہوگا یقیناً اللہ تعالیٰ راہ نہیں دکھلاتی ان لوگونکو جو اپنا نقصان کررہے ہیں ۔

پس ترک مودۃ وقطع موالاۃ کے سلسلہ میں ایک مسلم فرد کا اولین فرض ہی یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے آیات مذکورہ کے ماتحت اہل کفر سے اپنے قلبی تعلقات کا رشتہ کلیۃً منقطع کردے اگرچہ وہ اسکے اقارب واخوان ہی ہوں اور بالکل اسیطرح منقطع کردے جس طرح ان آیات کے ماتحت ابو عبیدۃ ابن الجراح رضی اللہ عنہ نے اپنے کافر باپ سے قلبی تعلقات منقطع کرلئے تھے کہ بالآخر بدر میں خود ہی ان کے قاتل بھی بنے ۔ جسطرح اسی تعلیم (شدۃ علی الکفار) کے ماتحت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر سے قطع مودۃ کرکے خود ہی اُحد میں اُسے قتل کیا ۔ حضرت عمر نے اپنے ماموں عاص ابن ہشام کو بدر میں قتل کیا ، حضرت علی وحمزہ اور عبید بن الحارث رضی اللہ عنہم نے عتبہ ولید بن عتبہ اور شیبہ ابن ربیعہ کو بدر میں قتل کیا ۔ جو ان حضرات کے قریبی اقارب تھے اور ایسا کرکے اسلامی غیرۃ اور صلابتہ فی الدین کی کیسی زبردست مثال قائم فرمادی ۔ جو ہمیشہ

اُمت کو غیرت وحمیت کی دعوت دیتی رہیگی۔

تبری | پھر قرآن کریم نے اس پر بس نکی بلکہ حکم دیا کہ اپنی اس ترک موالاۃ اور قلبی تنفر کا عام اعلان بھی کردو تاکہ غیر مسلم تمھارے قلب وقالب میں کوئی طمع نہ رکھ سکیں، جیسا کہ اللہ نے اپنے رسول کی برات بھی علی الاعلان پکاردی تھی۔

ان الذین فرّقوا دینھم وکانوا شیعًا لست منھم فی شیٔ۔	بیشک جن لوگوں نے اپنے دین کو جُدا جُدا کردیا اور گروہ گروہ بنگئے آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔

صفائی سے یہ تفریق واضح کردی گئی کہ لست منھم (تم ان میں سے نہیں ہو) لست منھم کی حقیقت اس کی ضد انت منھم سے واضح ہوسکتی ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ دو شخصیتیں واحد نہیں ہوسکتیں۔ زید اور عمر جب دو ہیں تو ایک نہیں ہو سکتے۔ اسلئے جب یہ کہا جائے کہ میں تجھسے ہوں اور تو مجھسے" تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تو میری نوع سے ہے۔ میرے امور میں شریک ہے۔ مجھ جیسا ہے اور میں تجھ جیسا ہوں۔ تیرا شریک اور تیرا ہمنوع ہوں۔

مسلمانوں کے ذات البین اور ان کے باہمی ائتلاف وارتباط کو اسی قسم کے الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے کہ بعضکم من بعض (تمھارے بعض تمھارے بعض سے ہیں) یعنی یہ سب بعض بعض ملکر ایک ہی نوع مقصود کے دو شریک ہیں۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت فرمایا۔

انت منی وانا منک	تو مجھسے ہے اور میں تجھسے ہوں۔

یعنی تیری اور میری ایک بات ہے۔ ہمارا معاملہ واحد ہے۔ ایک خاص حقیقت میں ہم متحد ہیں

پس جب یوں فرمایا گیا کہ لست منھم، تو ان میں سے نہیں) تو یہ نفی اسی پچھلے اثبات پر وارد ہوگی یعنی تیری اور ان کی ایک بات نہیں۔ تیرا اور ان کا معاملہ ایک نہیں۔ تو اور وہ کسی نوع مقصود کے دو شریک نہیں بلکہ الگ الگ ہیں۔ اسی حقیقت کو حق تعالے نے فرمایا کہ اسے رسول لست منھم فی شیٔ یعنی تو کسی چیز کے اعتبار سے کفار میں سے نہیں۔ انکا شریک

نہیں ان کی ساتھہ متحد نہیں تو جس نوع مقصود کا ایک فرد ہے وہ اور ہے اور کفار جس نوع کے شرکا رہیں وہ اور ہے۔ اسی لئے سورۂ کافرون میں اس تبرّی و علیحدگی کو اور واضح کر دیا گیا۔

قل یاایھاالکافرون لااعبد ماتعبدون ولاانتم عابدون مااعبد ولاانا عابد ماعبدتم ولاانتم عابدون مااعبد لکم دینکم ولی دین ٥ =

آپ کہہ دیجئے کہ اے کافرو نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبودوں کی پرستش کرتے ہو۔ اور نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرونگا۔ اور نہ تم میرے معبودونکی پرستش کروگے تمکو تمہارا بدلہ ملیگا۔ اور مجھکو میرا بدلہ ملیگا

یہ تبرّی و برارت ایسی ہی ہے جیساکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی کافر قوم اور اپنے کافر باپ سے فرمائی تھی۔

واذ قال ابراھیم لابیہ وقومہ اننی براء مما تعبدون

اور اسوقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے فرمایا کہ میں اس چیز سے بیزار ہوں جنکی تم عبادت کرتے ہو

اور ایسی ہی ہے جیساکہ قوم ابراہیمؑ نے مشرکین سے یہ کہکر تبرّی کی تھی کہ۔

انا برآؤ منکم ومما تعبدون من دون اللہ

ہم تم سے اور جنکو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو اُن سے بیزار ہیں

پس جبکہ انبیاء علیہم کا طریقہ کفار سے تبرّی اور اجنبیت کا اعلان کر دینا ہے تو ان کے پیرو اور حلقہ بگوش کیوں اسی روش کی رہروی پر مجبور نکئے جائینگے۔ آخر رسول نے اپنا ہی طریقہ تو ان کے سامنے پیش کیا ہے۔ جس کی پیروی کے وہ مدعی بھی ہیں۔

بہرحال قلب اور لسان دونوں کے ذریعہ سے کفار کا تعلق مسلمین سے منقطع کرا دیا گیا اور یہی دو چیزیں انسان میں اصل ہیں۔

لسان الفتی نصفٌ ونصفٌ فؤادہٗ		فلم یبق الا صورة اللحم والدم	

ترک سبیل

پھر اسی پر بس نہیں کیگئی بلکہ قلب و زبان کیطرح عام افعال و جوارح میں بھی مسلموں کو غیر مسلموں سے الگ اور ممتاز ہی رکھا گیا ہے۔

تاکہ مسلمان نہ ان کے کسی عملی پروگرام کے پابند بنیں اور نہ کسی آواز پر ان کے

ف آدھا آدمی زبان ہے اور آدھا دل۔ آگے سوائے خون اور گوشت کے اُس میں اور کیا باقی رہا ۱۲ منہ

پیچھے پیچھے ہولیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہرون علیہما السلام کو فرمایا گیا تھا کہ جب تمہیں علم اور استقامت راہ کی دولت دیدی گئی ہے۔ تو پھر تم کج راہوں اور جاہلوں کے پیچھے مت ہولینا۔

خدائے کریم نے حضرت موسیٰ و ہرون کو خطاب کرکے فرمایا کہ۔

فاستقیما ولا تتبعٰن سبیل الذین لا یعلمون	تو تم دونوں مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جنکو علم نہیں

ہی وصیت موسیٰ علیہ السلام نے طُور پر جاتے ہوئے ہرون علیہ السلام کو کی تھی کہ تم اپنی ہی صلاح واصلاح پر قائم رہنا اور مفسدوں کی پیروی مت کرنا۔

وقال موسیٰ لاخیہ ھرون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین	اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہدیا تھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل نہ کرنا۔

پس جبکہ انبیاء علیہم السلام کا طریق ایک صراط مستقیم ہے جس پر وہ علم و صلاح اور استقامت کیساتھہ قائم ہیں تو پھر غیر مسلموں کے سُبل متفرقہ جہل و فساد وغیرہ کے اتباع کی انھیں اور ان کے پیرؤں کو حاجت ہی کیا ہے۔ مسلمانوں کو تو یہ زرّیں اصول دیدیا گیا ہے۔

ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السُّبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔	بلا شبہہ یہ دین میرا راستہ ہی جو کہ مستقیم ہی سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہونپر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کردیں گی۔

ترک معاملات | پھر شریعت الٰہی نے صرف اتنی ہی مجانبت اور قطع اختلاط والتباس پر کفایت نہیں کی بلکہ اس امتیاز وتفریق کو اور زیادہ یوں نمایاں فرمادیا کہ ان سے معاملات بھی منقطع کرلو۔ اگر اسلامی سطوت وصولت اور اس کی حکومت کا علَم لہرا رہا ہو۔ محاکم شرعیہ اور عدالتیں کھلی ہوئی ہوں تو خلافت راشدہ اور حکومت دینیہ کے دستور العمل کے موافق مسلمان کفار سے استعانت واستمداد نہ لینگے سیاسیات میں انکو شریک نکریں گے اور اشتراک عمل سے حتی الامکان بچینگے۔

کیونکہ یہ معاملات کی ظاہری شرکت بھی آخر کار وہی موالاۃ وموانست پیدا کردیتی ہے۔ فاروق اعظم

رضی اللہ عنہ کی گہری سیاست نے اس پر کافی روشنی ڈالدی۔ ممالک خلافت میں اُن کا یہ فرمان شائع کیا گیا تھا کہ۔

ان لا تکاتبوا اهل الذمة فتجری بینکم وبینهم المودة ولا تکنوهم واذلوهم ولا تظلموهم۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)

ذمیوں کیساتھہ مکاتبت کا تعلق مت رکھو کہیں تم میں اور ان میں اس بہانہ سے مودۃ نہ پیدا ہوجائے اور انکو پناہ مت دو اور تم انکو ذلیل رکھو مگر ہاں اُنپر تعدّی نکرو۔

نیز فاروق اعظم اور ابوموسیٰ اشعری کے اُس مکالمہ سے اس قطع تعلقات ومعاملات اور اسکی پنہانی حکمت کا پورا پورا اندازہ ہوسکیگا جس کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند میں سند صحیح کی ساتھہ روایت فرمایا ہے۔

ابوموسیٰ رض قلت لعمر رضی اللہ عنہ ان لی کاتبا نصرانیا۔

میں نے کہا عمر رضی اللہ عنہ سے میرے یہاں ایک نصرانی کاتب ملازم ہے۔

عمر رض مالک قاتلک اللہ اما سمعت اللہ یقول یا ایها الذین آمنوا لا تتخذوا الیهود والنصاری اولیاء بعضهم اولیاء بعض الا اتخذت حنیفا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ تجھے کیا ہوا خدا تجھے غارت کرے کیا تو نے اللہ کا یہ حکم نہیں سُنا؟ کہ یہود ونصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔ کیوں نہ تو نے کسی مسلمان کو ملازم رکھا؟۔

ابوموسیٰ رض یا امیر المؤمنین ان لی کتابة وله دینه۔

میں نے کہا اے امیرالمومنین میرے لئے اسکی کتابت ہے اور اس کیلئے اُسکا دین ہے (مجھے اس کے دین سے کیا تعلق؟)۔

عمر رض لا اکرمهم اذ اهانهم اللہ ولا اعزهم اذ اذلهم اللہ ولا ادنیهم اذ اقصاهم اللہ تعالی۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں انکی تکریم نہیں کرونگا جنکی اللہ نے توہین کی اور میں انکو عزّت نہ دونگا جنکو اللہ نے ذلیل کیا۔ اور میں اُنھیں مقرّب نہ بناؤں گا جنکو اللہ نے دُور کیا ہے۔

اس پر مغز مکالمہ سے (جو فاروق اعظمؓ جیسے بیدار مغز خلیفہ رسالت کی ہدایت پر مشتمل ہے) یہ واضح

ہو جاتا ہے کہ۔

(۱) جبتک کوئی مضطرانہ ضرورت داعی نہ ہو اصل یہی ہے کہ غیر مسلمین سے استعانۃ اور وہ بھی ایسی کہ جس میں ان کی تکریم ہوتی ہو قرین عقل و دین نہیں۔

(۲) یہ عذر کسی طرح قابل سماعت نہیں کہ ہمیں صرف ان کی خدمات درکار ہیں نہ کہ انکا مذہب۔ کیونکہ اس تحصیل خدمات کے ذیل میں ان کیساتھ بعینہٖ اس شدۃ و تغلیظ کو کم یا محو کردیگی جو ایک مسلمان کا اسلامی شعار بتلایا گیا ہے۔ اور یہی قلّتِ تغلیظ بالآخر مداہنت، چشم پوشی اور اعراض عن الدین کا مقدمہ لیکر کتنے ہی شرعی منکرات کے نشو و نما کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

(۳) فاروق اعظم اور ابو موسیٰ کے بعد کوئی شخص ان جیسا تدین نہیں لا سکتا۔ لیکن اگر بالفرض ایسے بھی آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ ابو موسیٰ تو کفار کی خدمات حاصل کرنے سے روکدئے جائیں اور اسے نہ روکا جائے۔ مانا کہ ایک شخص پختہ اور راسخ الایمان بھی ہے اور اس اشتراک عمل سے اسمیں کوئی تزلزل بھی نہیں آسکتا لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایسی ذمہ دار ہستی کا اشتراک عمل عامۂ مسلمین کے لئے بڑی سے بڑی استعانۃ اور زیادہ سے زیادہ اختلاط کا دروازہ کھولدے عوام اپنے لئے اس طرز عمل کو حجۃ شمار کریں اور اس طرح یہ اختلاط و التباس عام ہو کر ناقابل تدارک مفاسد کا باعث بنجائے۔

(۴) جس مخلوق کی اسکے خالق نے تکریم نہ کی اور ان کے لئے عزت کا کوئی حصہ گوارا نہ کیا اُس خالق کے پرستاروں کی غیرت و حمیت کے خلاف ہے کہ وہ اسکے اعداء کی تکریم کریں۔ وہ جسے پھٹکار دے یہ اُسے پیار کریں۔ ورنہ یہ تو پھر اسلام کے نام سے شرائع آلٰہی کی توہین اور خود افعال باری ہی کی صریح تکذیب ہو جائیگی۔ نعوذ باللہ منہ۔

(۵) اسلام میں سیاستِ محضہ مقصود نہیں بلکہ محض دین۔ سیاسی انجمنیں محض تحفظ دین کیلئے گوارہ کیجاتی ہیں پس اگر سیاستہ ہی کا کوئی شعبہ تخریب دین یا مداہنت و حق پوشی کا ذریعہ بننے لگے تو بیدریغ اسکو قطع کرکے دین کی حفاظت کی جائیگی۔ ورنہ در صورت خلاف قلب موضوع

اور انقلاب ماہیت لازم آجائیگا۔ کہ وسیلہ مقصود ہو جائے اور مقصود وسیلہ کے درجہ پر بھی نہ رہے۔

ترک مجالست پھر اسی تحفظ خود اختیاری اور رفع التباس میں شریعت نے ایک قدم اور بڑھایا کہ غیر مسلموں کے ساتھ مجالست بھی ترک کردی جائے اگر ان کے ساتھ نشست و برخاست اور میل جول عام ہو جائے تو رفتہ رفتہ اسی موالاۃ و مودّۃ کی تولید کا پھر قوی اندیشہ ہے جس سے مسلمانوں کے مخصوص قومی و مذہبی شعائر التباس کی زد میں آجائیں اور دین ضائع ہو جائے کیونکہ مجالس کفر و نفاق کا عام انداز تحقیر دین اور استہزار آیات اللہ کیساتھ مسلمانوں کو اُن کے دین سے بدظن بنانیکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسلئے قرآن نے فرمایا۔

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بہا و یستھزأ بہا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ	اور اللہ تعالےٰ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہیہ کیساتھ استہزار اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔ جبتک کہ وہ اور کوئی بات شروع نکردیں۔

نیز جبکہ ایک منافق محض ظاہری میل جول اور زبانی جمع و خرچ کی بنا پر مسلم کہلایا جاسکتا ہے تو کیا ایک مسلم حنیف پر اس ظاہری مشارکتہ کفار یا مجالستہ کے سبب کفر و نفاق کے احکام جاری نہیں ہو سکتے؟ قرآن کریم نے خود ہی فیصلہ فرمادیا کہ۔

انکم اذا مثلھم۔ } اس حالت میں تم بھی اُن ہی جیسے ہو جاؤگے۔

ترک اہوار ان تمام مراتب کے بعد ترقی کرکے شریعت نے اس رشتۂ اختلاط کے اس تار کو بھی قطع کردیا کہ مسلمان غیر مسلموں کی اہوار جہالت اور خواہشات ضلالت پر کان بھی دھریں یا انکے نفسانی جذبات کا کچھ بھی احترام کریں۔ کیونکہ اگر اُن کی اہوار نفس میں سے تم نے کسی ایک خواہش پر بھی لبیک کہا تو یہی ایک پیروی تمہارے لئے تو دوسری پیرویوں کا ذریعہ اور ان کے لئے دوسری خواہشات پیش کرنے اور ان کو منوانے کا ایک قوی وسیلہ اور حجتہ بنجائیگی۔ اور نہ معلوم انجام کار ان کی اہوار پر اسلام کا کسقدر سرمایہ طوعًا و کرہًا نثار کردینا پڑے پس

قرآن کریم نے بتلایا کہ ان جاہلوں کی پیروی کرنا حق کی پیروی سے باز رہنا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ۔

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون ۔

پھر ہم نے آپکو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلئے۔

کہیں فرمایا

ولا تتبع اهواءهم عما جاءك من الحق ۔

اور یہ جو سچی کتاب آپکو ملی ہے اس سے دور ہو کر انکی خواہشوں پر عملدرآمد نہ کیجئے۔

کہیں فرمایا۔

وان احكم بينهم بما انزل الله ولا تتبع اهواءهم واحذرهم ان يفتنوك عن بعض ما انزل الله اليك ۔

اور ہم حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کے باہمی معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور انکی خواہشات پر عملدرآمد نہ کیجئے اور ان سے یعنی انکی اہواء سے احتیاط رکھئے کہ وہ آپکو خدا کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بچلا دیں۔

کہیں ڈرا کر فرمایا۔

ولئن اتبعت اهواءهم بعد ما جاءك من العلم ما لك من الله من ولي ولا واق ۔

اگر آپ ان کے نفسانی خیالات کا اتباع کرنے لگیں بعد اسکے کہ آپ کے پاس علم پہنچ چکا ہے تو اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی آپ کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی بچانیوالا۔

بہرحال ان آیات میں اہواء کفار کی پیروی کو اس بلاغت کے ساتھ روکا گیا کہ ساتھ ہی کہیں علم کہیں۔ حق کہیں۔ شریعت کہیں ما انزل اللہ کے کلمات سے اسطرف رہنمائی بھی فرما دی کہ اتباع کے لئے یہ چیزیں کافی ہیں۔ پھر کیا ان کے بعد بھی کسی چیز اور وہ بھی اہواء کفار کی پیروی کی حاجت رہجاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کی خواہشات کا اتباع کرکے تو تم علم کے بجائے جہالت۔ حق کے بجائے باطل۔ شریعت کے بجائے سُبل متفرقہ۔ اور ما انزل اللہ کے بجائے القاء شیطانی کے دلدل میں پھنس جاؤگے۔ اتستبدلون الذی ھو ادنی بالذی ھو خیر۔

اعلان بغض وعداوۃ | قلب وقالب کے تمام رشتے منقطع کر دینے کے بعد اب شریعت نے ایک اور

قدم اٹھایا کہ احبار الٰہی (مسلمین) ان اعداء اللہ سے اگر کوئی تعلق رکھیں تو وہ عداوۃ اور بغض فی اللہ کا تعلق ہونا چاہیئے نہ کہ حب دراُنس کا کیونکہ وہ خدا کے دشمن ہیں اور مسلمانوں کو وہ سب کے سب اور اُن کا قائد اعظم (شیطان) اپنی انتہائی عداوۃ کے سبب جہنم کیطرف دھکیل دینا چاہتے ہیں۔

ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحاب السعیر	یہ شیطان بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اُسکو دشمن سمجھتے رہو وہ تو اپنے گروہ کو محض اسلیئے بلاتا ہے تاکہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہو جاویں

نیز جبکہ یہ عداوۃ کسی نفسانی داعیہ سے نہیں بلکہ محض اسلیئے قائم ہوئی کہ انھوں نے حق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اسکی بنا محض صداقت پر ہوئی اسلیئے بے دھڑک اس عداوۃ کا اعلان بھی کر دو تاکہ اعداء اللہ تم کو اپنی طرف کھینچنے اور ملا لینے سے مایوس ہو جائیں جیساکہ قوم ابراہیم نے اعلان کیا تھا اور صاف طور پر پکار دیا تھا کہ۔

کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ	ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کیلئے عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا جبتک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

پھر فرمایا کہ اعلان عداوۃ کے بعد خاموش نہ بیٹھ جاؤ بلکہ حسب استطاعت سامان جنگ کی تیاری بھی جاری رکھو۔ تاکہ یہ عداوۃ اُسوقت تک مستحکم رہے جبتک وہ کفر سے تائب نہو جائیں۔

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونھم	اور ان کافروں کیلئے جسقدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اسکے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو نیز جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں۔ اور اُنکے علاوہ دوسروں پر بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفار کیساتھ مسلمانوں کی آمادگی عداوۃ پھر اعلان عداوۃ پھر ابقاء عداوۃ کے سلسلہ ان کا خطاب ہی بارگاہ الٰہی سے اشداء علی الکفار نازل ہو گیا۔ اور وہ خدا کی فوج کے سپاہی بن گئے جنکو خدا نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے چن لیا۔ پس مسلم و کافر دو فوجیں ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا اور جنگ آزما رہی ہیں ہمیشہ ایک کی

امداد جنود ملائکہ اور ایک کی جنود شیاطین سے ہوتی رہی۔ پھر ہمیشہ پہلے کے حق میں نتیجۃً فوز و فلاح کے دروازے کھولے گئے اور دوسرے کے لئے انجام کار ذلت و پھٹکار کی رسوائی متعین رہی ہے۔

ترکِ تشبہ | پس ایسی دو متبائن و متضاد نوعوں اور ایسی دو متحارب قوموں میں یکجہتی یا مخالطہ و مشابہتہ آخر کس راہ سے آسکتی ہے۔؟ اور کیسے ہوسکتا ہے کہ شریعت الٰہی اُدھر تو قلب مسلم سے موالاۃ تک نکالدے۔ اُن سے تبرّی اور عداوۃ کے اعلان تک کا حکم دیدے۔ معاملات اور مجالستہ تک ترک کرادے۔ حتیٰ کہ دور سے ان کی کسی ہوائے نفس پر کان دھرنے کی بھی اجازت نہ دے اور ادھر اسکی اجازت دیدے کہ ہم سراسر کفار کے مشابہ بنجائیں، صورۃ و سیرۃ میں اُن کی شبیہ ہوجائیں اور ان کی اور ہماری ظاہری ہیئتہ، اُن کا اور ہمارا لباس، اوضاع و اطوار۔ اور عام معاشرت یکساں ملتی جلتی ہوجائے؟ ناممکن اور محال ہے حتیٰ یلج الجمل فی سم الخیاط نہیں بلکہ ان دونوں نوعوں کا باہم برسرِ عداوۃ اور جنگ آزما ہونا ہی خود اس کا مقتضی ہے کہ صرف باطن ہی نہیں بلکہ انکی ظاہری ہیئتوں اور ان کے اوضاع لباس وغیرہ میں بھی کافی امتیاز اور تفاوت ہونا چاہیئے۔ کیونکہ میدانِ مصاف میں جبکہ دو دشمنوں کی فوجیں باہم گتھی ہوئی ہوں اور بے پناہ تلواریں ٹکرا کر شور محشر بپا کررہی ہوں تو اس شور و شغب اور تداخل افواج کی محشر خیزی میں صرف ظاہری ہیئت و لباس اور پلٹنوں کی جنگی وردی ہی اپنے اور پرائے میں امتیاز پیدا کرتی ہے جس سے محبت و عداوۃ کا صحیح معیار قائم رہتا ہے ورنہ اگر اس ہنگامہ آرائی میں کوئی سپاہی دشمن کی وردی پہنکر اپنی فوج میں آئے اور ہزار زبان سے چلا کر بھی اعلان کرے کہ وہ دشمن کی فوج میں سے نہیں ہے پھر بھی اُس پر بھی حکم لگایا جائیگا کہ وہ انہی میں سے ہے کہ من تشبہ بقوم فھو منھم اور اس لئے جو رویہ دشمن کے سپاہیوں سے برتا جارہا تھا وہی اس کے ساتھ بھی عمل میں لایا جائیگا۔ لیکن اسی حالت میں اگر دشمن کی فوج کا ایک سپاہی اپنے حریف کی فوجی وردی پہنکر یہاں میں آملے تو وہی بے پناہ تلواریں اسکے سر پر

سایہ رحمت ہوجاتی ہیں۔ اور اسوقت تک اس کو ضرور نجات ملجاتی ہے۔ جبتک کہ اس کا نفاق آشکارا نہو جائے۔

پس یہ دو فوجیں (مسلم و کافر یا حزب اللہ او رحزب الشیطان) جبکہ مذہبی میدان میں برسرپیکار ہوں اور ازل سے رہتی آرہی ہوں تو کیوں ایسا نہونا چاہئے کہ انکی فوجی وردی انکے اسلحۂ جنگ اور انکی امتیازی نشانات وغیرہ بھی ایک دوسرے سے ممتاز اور سرتاسر نمایاں رہیں تاکہ دنیا کے اس بین الاقوامی اژدہام میں دوست اور دشمن کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا جائے۔ اور کیوں ایسا نہو کہ ایک سپاہی اپنی وردی تبدیل کر دینے پر اسی فوج کا آدمی سمجھا جائے جسکی وردی اُس نے اوپر چُست کرلی ہو۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے حزب اللہ کی وردی تو لباس التقویٰ تجویز فرمائی اور حزب الشیطان کی لباس الجوع والخوف کیونکہ پہلے لشکر (حزب اللہ) کی ساری زور آزمائی نہ ملک گیری کے لئے ہے نہ جوع الارض اور ہوس زر کے لئے بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے اسلئے یہ لشکر مخلوقات اور اس کے نمائشی جاہ و جلال سے مرعوب ہونے کے بجائے صرف خدا سے ڈرتا اور تقویٰ کی راہ چلتا ہے۔ باطناً اُس کے عزائم و افکار اور ظاہراً اُس کے متقیانہ افعال و لباس وغیرہ سے تقویٰ و تدین ہی کی روشنی چھننے لگتی ہے گویا تقویٰ اسکے قلب و قالب پر لباس کیطرح چھا جاتا ہے۔

اور تقویٰ کا لباس یہ اُس (عام لباس) سے بڑھکر ہے اور یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ شاید یہ لوگ بیدار ہوں	ولباس التقویٰ ذٰلک خیر ذٰلک من آیات اللہ لعلہم یذکرون۔

اور دوسرے لشکر کی تمامتر جد و جہد لوجہ اللہ ہونے کے بجائے جبکہ محض جوع الارض اور حظوظ دنیا کی تحصیل کے لئے ہوتی ہے اسلئے وہ ایک خدا سے ڈرنے کے بجائے ماسوی کے ایک ایک ذرہ سے کانپتا اور لرزتا ہے یحسبون کل صیحۃ علیہم اور اسی لئے قلعوں اور دیواروں کی آڑ لیکر اپنے بودے اسلحہ کی نمائش کرتا ہے لا یقاتلونکم جمیعاً الا فی قریٰ محصنۃ او من وراء جُدر باسہم بینہم شدید

ع ہر غل پکار کو اپنے ہی اوپر خیال کرنے لگتے ہیں ۱۲ ع یہ لوگ سب ملکر بھی تم سے نہ لڑیں گے مگر محفوظ بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں ۱۲

پس جوع الارض اُسے جنگ پر اُبھارتی ہے مگر خوف مخلوق آخر کار پھر ناکامی کے غار میں ڈھکیل دیتا ہے گویا جوع اور خوف نے لباس کیطرح اسکے ظاہر و باطن کا احاطہ کر لیا ہے۔ اسی لئے انکے تمام اعمال و افعال اور لباس وغیرہ پر اسی جوع و حرص اور طمع و خوف کا اثر نمایاں رہتا ہے۔

پس قرآن کریم نے ان دونوں فریقوں کی ظاہری مماثلت و مشابہت تک قطع کر دینے کا بھی حکم صادر فرما دیا تاکہ مطیع و نافرمان اور صادق و کاذب الگ الگ نمایاں ہو جائیں۔ اور مسلمانوں کے علم و عمل کے کسی شعبے میں کفار کے لئے کوئی حجت اور طمع باقی نہ رہ سکے۔ فرمایا۔

الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فاسقون۔	کیا ایمان والوں کے لئے ابات کا وقت نہیں آیا کہ انکے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اسکے سامنے جھک جاویں اور وہ ان لوگوں کیطرح نہ ہو جاویں جنکو انکے قبل کتاب ملی تھی پھر اُن پر ایک زمانہ دراز گذر گیا پھر انکے دل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی انہیں کے کافر ہیں۔

پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ۔	اے ایمان والو تم ان لوگوں کیطرح مت ہونا جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذا دی تھی۔

ایک جگہ فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا۔	اے ایمان والو تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو منکر ہو گئے۔

پہلی آیت میں عام اہل کتاب دوسری میں یہود اور تیسری میں بالعموم تمام کفار کے مثل ہو جانے ان کی عام موافقت اور ان کے اتباع سے روکا گیا۔ اس انقطاع مثلیۃ سے اسی تشبہ و مماثلت کا انقطاع مقصود ہے۔ ورنہ مطلقاً کفر سے روکا جانا ان الفاظ میں بھی ممکن تھا کہ کفر نکرو یا کافر نہ ہو۔ لیکن کافر ہو جانا اور چیز ہے اور کافروں کی مشابہت پیدا کرنا

ان کی سی شکل و صورت بنانا اور ہے - ایک کھلے ہوئے غیر مسلم سے جس کی ہر روش اسلام سے الگ ہے - اسلام اور اسکی مخصوص اوضاع و اطوار کو اتنا نقصان نہیں پہونچ سکتا - جتنا کہ اس مسلم سے جو کافر نما بنکر اسلام کا مدعی ہو - کیونکہ پہلی صورت میں اسلام و کفر الگ الگ نمایاں رہتے ہیں اور اس دوسری صورت میں عملاً وقولاً اسلام و کفر میں التباس کا دخل آجاتا ہے جس سے کسی کا وجود بھی نمایاں نہیں رہسکتا بلکہ دونوں معدوم سے نظر آنے لگتے ہیں اور یہ ثابت ہوچکا ہے کہ التباس کا نتیجہ عدم اور فنا محض ہے - وجود و بقا اگر ہے تو صرف امتیاز ہی میں ہے - پس آیات مندرجۂ بالا میں اسی التباس اسلام بالکفر اور اسی مشابہت مسلم بالکافر کو مٹا کر ان میں باہم تفریق و امتیاز پیدا کیا گیا ہے - تاکہ اسلام و کفر اور نور و ظلمت مخلوط نہونے پائیں - اور ہر ایک اپنی اپنی حقیقت کو الگ الگ نمایاں کرتا رہے -

———— (بقیہ) ————

فصل

قرآنی آیات کے بعد اب قرآن کی حقیقی اور اولین تفسیر یعنی ذخیرہ احادیث میں منع تشبہ کی حیثیت اس کی اہمیت اور اس کی شدید ترین ضرورت دیکھئے کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے معرکۃ الآرا خطبے میں صحابہ کے ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے منع تشبہ کی بات کیسا اہتمام بالشان ارشاد سنایا۔

الا کل شیء من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔	خبردار ہو جاؤ کہ جاہلیۃ کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے کچل دی گئی۔

جاہلیۃ کی تفصیل ہم نے ایک مستقل فصل میں کی ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ جاہلیۃ درحقیقت اسلام کے سوا تمام مذاہب کا عنوان ہو گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہو گا کہ اسلام کے آورده احکام کے سوا ہر وہ دستور العمل جو رائج تھا دیا ہے) میرے قدموں کے نیچے کچل دیا گیا۔ اور اس کا کوئی وجود و اعتبار نہیں رہا اب کسی کو حق نہیں کہ اسلامی دستور العمل چھوڑ کر اسے اختیار کرے اور خیر کا متمنی رہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

ابغض الناس الی اللہ ثلثۃ ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنۃ جاھلیۃ ومطلب دم امرء بغیر حق۔	سب سے زیادہ مبغوض خدا کے نزدیک تین قسم کے لوگ ہیں وہ جو حرم میں زندقہ و الحاد کا کام کرے۔ دوسرے وہ جو اسلام میں جاہلیۃ کے طریقے تلاش کرے۔ اور تیسرے وہ جو کسی شخص کا خون ناحق بہائے۔

یہ جاہلیۃ کے طریقوں کا اسلام میں ڈھونڈنا اور اسلامی طرق چھوڑ کر ان پر عمل پیرا ہونا ہی تشبہ بالاغیار ہے۔ پھر ایک جگہ نہایت صریح الفاظ میں بصورت ضابطہ وکلیہ ارشاد فرمایا۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلے اللہ	ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم (رواہ ابوداؤد)

علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی قوم کے ساتھ (صورتاً) بھی مشابہت اختیار کی وہ (انجام کار) اسی قوم میں سے (حقیقۃً بھی) ہو جائیگا۔

یہ حدیث ہر اعتبار سے تشبہ کا ایک عام و تام قانون ہے۔ حدیث ثابت کرتی ہے کہ ظاہری تشبہ جس قوم کیساتھ بھی کیا جائے ابرار و اخیار کیساتھ کیا جائے یا اشرار و فجار کے ساتھ خیر میں ہو یا شر میں، معاشرۃ میں ہو یا تہذیب و تمدن میں۔ انجام یہ ہے کہ متشبہ اپنا وجود چھوڑ کر اسی قوم کے وجود میں مدغم ہو جاتا ہے جس کی اس نے تشبہ کیا تھا۔

پس حدیث مذکور نے روشن کر دیا کہ تشبہ بالغیر جس طرح حسی اور تکوینی طور پر محو و فنا کا ذریعہ ہے۔ ٹھیک اسیطرح شرعی طور پر بھی وہ فنا شرائع کا ایک موثر طریقہ ہے۔ اور یہ بات کافی طور پر واضح ہو گئی کہ ہر چیز خواہ کونی ہو یا شرعی اپنی ہستی یا خودی باقی رکھنے کے لئے ترک تشبہ کے اصول کی محتاج ہے۔

ورنہ درصورت تشبہ اسکی وہی ہستی باقی نہیں رہسکتی جو ابتک تھی بلکہ متشبہ بہ کی ہستی میں صورتاً۔ سیرۃً۔ اور حکماً مدغم ہو جائیگی۔ چنانچہ فقہاء امۃ اسی حدیث کی تنقیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر کوئی جن سانپ کی صورت میں آجائے تو اسکے قتل کر دینے میں کوئی باک نکرنا چاہئے من قتل ذو ذ نیہ فدمہ ھدر کیونکہ سانپ اور بچھو کو شریعت نے حرم میں بھی پناہ نہیں دی اور جبکہ ایک جن نے اس غیر معصوم الدم مخلوق سے تشبہ کیا تو وہ انھیں میں سے ہو گیا۔ پس اسپر سانپ بچھو ہی کے احکام جاری کر دئے جائیں گے۔

اسی حدیث کو سامنے رکھکر صحابہ و تابعین اور تمام سلف نے ہر قسم کی متشبہانہ تبدیل ہیئۃ اور تبدیل معاشرۃ کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور اسی حدیث سے استدلال کرتے رہے حضرت حذیفہ ابن الیمان کو ایک دعوت میں بلایا گیا۔ آپ نے جاکر دیکھا کہ اس تقریب

ؔ جو شخص اپنی ہیئتہ کے سوا کسی دوسری ہیئتہ میں قتل کر دیا گیا تو اسکا خون ضائع ہے (جس کا قصاص نہیں) ۱۲ منہ

میں کچھ عجمی رسمیں ادا کی گئیں ہیں تو واپس ہو گئے اور فرمایا کہ من تشبہ بقوم فہو منھم (اقتضاء الصراط المستقیم)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ گدی کے بال منڈانے کیسے ہیں۔ فرمایا کہ یہ تو مجوسیوں کا فعل ہے و من تشبہ بقوم فہو منھم (اقتضاء)۔

اسی حدیث کے ماتحت حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ قلما تشبہ رجل بقوم الا کان منھم (بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کسی شخص نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی ہو اور آخر کار اسی قوم میں سے نہ ہو گیا ہو۔

اسی حدیث کے ماتحت خطاب ابن معلی مخزومی نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی (جسکو ابن حبان صاحب صحیح نے اپنی کتاب روضۃ العقلاء میں نقل کیا ہے کہ تشبہ باھل العقل تکن منھم وتصنع للشرف تنل (کہ (داناؤں کی مشابہت اختیار کر تو تو انھی میں سے ہو جائیگا اور بناوٹ سے بھی اگر شرف کی طرف جھکیگا تو تو شرف حاصل کرے گا۔

ان التشبہ بالکرام فلاح		فتشبھوا ان لم تکونوا مثلھم

پس شرعی نقطہ نگاہ سے یہ حدیث کم از کم تشبہ مطلق کی حرمت کے لئے ایک زبردست استدلال ہے۔ بلکہ اگر اس کے ظاہر پر جمود کیا جائے تو وہ تشبہ بالکفر کی حرکات کو کفر اور متشبہ کو کافر بعینہ اسیطرح ثابت کرتی ہے جس طرح کہ آیت کریمہ ومن یتولھم منکم فانہ منھم ایک موالات کنندہ کو کفار میں شامل کر رہی ہے۔ گو کفر دون کفر کے قاعدہ سے اس کفر میں شدید و خفیف درجات پیدا ہو جائیں۔ لیکن اسمیں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مطلق تشبہ بالکفار ایک مسلم کو کفر کی سرحد پر لیجا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ کیونکہ جب اسلامی حدود تشبہ کے حربوں سے توڑ دی جائیں گی (خواہ وہ معاشرتی ہوں یا تمدنی۔ تعبدی ہوں یا محض اخلاقی) تو یقیناً انہی شکستہ حدود کے راستوں سے ان کی اضداد (کفریہ حدود) قائم ہوتی جائیں گی۔ اور اس طرح اس متشبہ کا اسلامی قصر چند دن میں منہدم ہو جائیگا۔ (العیاذ باللہ)

لے پس اے لوگو کریموں سے تشبہ کرو اگر تم ان جیسے نہیں ہو کیونکہ کرام کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا [illegible]

وفصل

تشبّہ اور قرون سلف

قرآن وسنت کی ان کھلی کھلی تصریحات کے بعد اب ہم چاہتے ہیں کہ امت کے برگزیدہ قرون کا وہ طرزِ عمل پیش کریں جو مسئلہ تشبّہ پر پوری روشنی ڈال رہا ہے۔ تاکہ اس مستمر علمی نقشہ سے مسطورہ تصریحات اور بھی زیادہ منکشف اور مشیّد ہو جائیں۔ ان قرون میں سب سے زیادہ مقدس دور صحابہؓ کا ہے۔ اور صحابہ کے اس باخیر دور میں سیاست فاروقی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منع تشبّہ میں نہایت قوت سے کام لیا اور اس اصول کے ذریعہ اسلامی خصائص کی پوری حفاظت فرمائی۔ انہوں نے نہ صرف کلیات اور اصول ہی کا تحفظ کیا۔ بلکہ جزئیات کے تحفظ میں اصول سے بھی زیادہ مستعدی دکھلائی۔ کیونکہ جزئی نقائص ہی سے انجام کار اصولی نقائص بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں ایاکم و محقّرات الذنوب (چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو) کیونکہ صغائر کو حقیر سمجھنے ہی سے کبائر پر جرأت وجسارت ہو جاتی ہے۔ پس فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے معمولی معمولی چیزوں میں بھی تشبّہ بالاغیار سے بچانے کے احکام نہایت قوت سے صادر فرمائے۔ ہم ان کے ایک طویل فرمان کے جو آذربائیجان کی عرب رعایا کے نام بھیجا گیا ہے۔ چند جملے پیش کرتے ہیں جنہیں قومی خصائص کے ابقاء پر کس شدّہ کے ساتھ عربوں کو ابھارا گیا ہے اور انکی قومی روایات کو یاد دلایا گیا ہے۔

اما بعد فاتزروا وارتدوا وانتعلوا وارموا بالخفاف والقوا السراويلات وعليكم بلباس

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اے لوگو ازار اور چادر استعمال کرو چپل پہنو۔ خفاف ترک کرو۔ پاجاموں کے پابند مت بنو

ایاکم اسمٰعیل وایاکم والتنعم وزی العجم وعلیکم بالشمس فانہا حمام العرب وتمعددوا واخشوشنوا واخلولقوا واقطعوا الرکب وارموا الاغراض وانزوا۔ (کنز العمال)۔

اپنے جد اعلیٰ اسمٰعیل علیہ السلام کا ہی لباس اپنے لئے ضروری سمجھو۔ اور خبردار تنعم اور عجمیوں کی ہیئت و مشابہت اختیار نہ کرنا حمام کی ضرورت ہو تو دھوپ کو کافی سمجھو یہی عرب کا حمام ہے علاوہ شوخی اختیار نہ کرو۔ کھردرا کپڑا پہنو۔ پھٹے پرانے سے پرہیز نہ کرو

سواری [illegible] اور [illegible] کود کر [illegible]

لباس میں۔ معاشرۃ میں اور تمام شعبہائے زندگی میں اسی پچھلی روش پر پختہ رہنے کی ہدایت دینے سے غرض وہی قومی امتیاز قائم کرنا اور تشبہ والتباس کا مٹانا ہے۔ یہ کلمات بتلاتے ہیں کہ جزئی حد بندی صحابہ میں کسقدر اہتمام سے رائج تھی جو آج تنگ نظری پر محمول کیجا رہی ہے اس ذہنیت کے انقلاب کا کیا ٹھکانا ہے کہ آج یہ تحفظ حدود قومی رواداریوں کے خلاف ایک تنگ نظری سمجھی گئی ہے اور کل تک یہی چیز اسلام اور اسلامیوں کے نشو و نما کی اصل ضمانت دار تھی۔ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھ لو کہ ان جزئیات کے ذریعہ جسقدر بھی قوت سے یہ قدمار تقلیدیہ مسلک۔

تحدید مشرب اور تقیید خیالات وافکار پر عامل رہے اسیقدر سطوت وجلال کی روشنی ان کے اس تنگ مطلع سے ابھرتی رہی۔ اور ماضی کو چھوڑ کر اب حال کو بھی دیکھ لو کہ آج اس اصطلاحی آزادی روشن خیالی۔ فراخدلی اور وسیع المشربی کا دائرہ جسقدر وسیع ہوتا جا رہا ہے اسیقدر قومی عزۃ اسلامی شوکت اور مسلمانوں کے حقیقی رعب و وقار کا دائرہ سمٹتا بھی آ رہا ہے۔

اگر یہ زمانہ حال کی رواداری اور فراخدلی ہی کچھ شوکتوں اور ترقیوں کی پردہ دار ہوتی تو پھر آج کے دہ درد مسلمان ان رواداریوں کے بل بوتے پر اس سے کہیں زیادہ شوکت و عظمت دنیا پر قائم کر لیتے جتنی کہ (معاذاللہ) چودہ صدی پیشتر کے ان تنگ نظروں نے دنیا کو دکھلائی تھی نہ کہ روز بروز ابھرنے کے بجائے یونا فیونا پست ہوتے چلے جاتے؟۔

پس اس ماضی وحال کو ضرب دینے سے حاصل ضرب یہ ہی نکلتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنے قومی و مذہبی وجود کو اسوقت تک قائم نہیں رکھ سکتی جبتک کہ اس اصول بقاء و تحفظ (منع تشبہ) پر کاربند نہ ہو۔ ہاں مگر یہ کہنا بھی ہرگز مبالغہ نہیں کہ یہ اصول انتہائی حکمت

کیساتھ اسلام ہی نے قائم کیا اور وہی اپنی حقیقی راست بازی کی بدولت اس کا حقدار بھی ہے کہ تمام حدود کو مٹا کر صرف اپنی ہی حدود قائم رکھنے کا عزم باندھ لے ورنہ اگر کوئی باطل اور تنگ مذہب لغویت آمیز چھوت چھات کے ذریعہ اسلام کے ہوتے ہوئے بھی اسکی نقل اُتارنے لگے تو اس کا پول زیادہ دیر تک ڈھکا نہیں رکھ سکتا۔

خلافت فاروقی میں جبکہ عجمی ممالک کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور عربوں میں عجمیوں کا اختلاط بڑھنے لگا تو بہت زیادہ اس تحفظ حدود کا اہتمام کیا گیا۔ کیونکہ بہت سے عربوں کا اپنی خالص اور سادہ عربیت کو چھوڑ کر عجمیوں کی نظر فریب معاشرۃ کا شکار ہو جانا پھر اپنی حقیقی سذاجت کو اس التباس کی بدولت کھو بیٹھنا بعید نہ تھا۔

پس جہاں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے روز بروز فتوحات کو ترقی دی وہیں قوۃ کیساتھ اپنی عمیق سیاست سے ادھر تو اسلامی خصوصیات اور مذہبی امتیازات باقی رکھنے اور عجمیوں سے مشابہ نہ ہو جانے کی مسلمانوں کو تاکید کی جیسا کہ پہلے فرمان سے واضح ہو چکا ہے اور اُدھر اُن غیر مسلم عجمیوں کو بھی اپنے فرامین سے چونکا دیا کہ وہ بھی بحالت کفر مسلمانوں کی زی و ہیئت اختیار نکریں تاکہ ہر قوم اپنی اپنی خصوصیات میں نمایاں رہے اور اس طرح اس مہلک التباس کا سدباب ہوتا رہے۔

مندرجہ ذیل فرمان فاروقی میں جو تمام قلمرو خلافت میں مشتہر کیا گیا اور عملاً نافذ ہوا ذمیوں سے بطور شرائط یہ عہد لیا گیا تھا کہ۔

ان نوقر المسلمین ونقوم لهم من
مجالسنا ان ارادوا الجلوس ولا نتشبه
بهم فی شیٔ من ملابسهم قلنسوة او عمامة
او نعلین او فرق شعر ولا نتكلم بكلامهم
ولا نتكنی بكناهم ولا نركب السروج
ولا نتقلد السیوف ولا نتخذ شیئا

ہم مسلمانوں کی توقیر کریں گے۔ ہم اپنی مجلسوں سے کھڑے
ہو جائینگے اگر وہ بیٹھنے کا ارادہ کریں گے۔ ہم انکی ساتھ
کسی بات میں مشابہت و تشبہ لباس میں نکرینگے۔ ٹوپی ہو
یا عمامہ۔ جوتے ہوں یا سر کی مانگ۔ ہم انکا سا کلام
نکرینگے۔ ہم انکی سی کنیتیں نہ رکھینگے۔ ہم زین پر
گھوڑے کی سواری نکریں گے۔ تلوار نہ لٹکائیں گے۔

من السلاح ولا نحمله[9] ولا ننقش خواتيمنا
بالعربية ولا نبيع[10] الخمور وان[11] نجز مقادم
رؤسنا وان[12] نلزم زينا حيثما كنا وان[13]
نشد الزنانير على اوساطنا وان[14] لا نظهر
الصليب على كنائسنا ولا[15] نظهر صليبا
ولا كتبا في شئ من طرق المسلمين ولا
اسواقهم ولا نضرب[16] بنواقيسنا في كنا
ئسنا الا ضربا خفيفا ولا[17] نرفع اصواتنا
مع موتانا ولا نظهر النيران معهم في
شئ من طرق المسلمين (وفي رواية حرب[18] بالخلال)
ولا[19] نرفع اصواتنا في الصلوة ولا القراءة
في كنائسنا فيما يحضره المسلمون ولا[20]
نخرج باعوثا ولا شعانينا وان لا نجاورهم
بالجنائز (اقتضاء الصراط المستقيم لابن تيمية)

کوئی ہتیار نہ رکھینگے۔ ہم اپنی مہروں کے نقش عربی میں
کندہ نکرائینگے۔ شراب کا بیوپار نکریں گے۔ ہم طرہ (سر کے
اگلے حصہ کے وہ بال ہیں جو بطور فخر و تزئین کے رکھے جاتے ہیں)
کٹوا دینگے۔ جیساکہ آج بھی انگریزی بالوں کے نام سے یہ طرہ
مشہور ہی۔ ہم جہاں بھی رہینگے اپنی ہی وضع پر رہینگے
ہم اپنے کمروں پر زنار باندھینگے۔ گرجوں پر صلیب کو بلند
نہ کرینگے مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں اپنی
کتابوں اور صلیب کو ظاہر نہ کرینگے۔ ہم اپنے گرجوں میں
ناقوس نہایت ہلکی آواز سے بجائینگے۔ ہم اپنے مردوں کے
ساتھ آوازیں نہ اٹھائینگے۔ مسلمانوں کی سڑکوں میں
ہم اپنے مردوں کے ساتھ آگ نہ لیجائینگے۔ (یہ مجوس کے
متعلق ہے کیونکہ وہ آگ کے پجاری ہیں) (پھر حرب کی
روایت میں ہی بروایت خلال) کہ ہم اپنی نمازیں بلند
آواز سے نہ پڑھینگے۔ اگر مسلمان کہیں قریب ہوں تو
گرجوں میں قرات بھی زور سے نہ پڑھینگے۔ اور نہ ہم دعاء استسقا کیلئے ہجوم لیجائینگے۔ اور نہ ہم اتوار کی عید اور
اس کا جشن منائینگے۔ ہم مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن بھی نہ کریں گے۔

اس فرمان فاروقی سے جو اصول ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دو قوموں میں باعتبار مذہب
و معاشرۃ کھلا امتیاز ہونا چاہیے تاکہ ہر قوم کے حق و باطل کو اسکو اصلی صورت میں پرکھا جا سکے اور
ہر دو کے اصول و فصول دائرۂ التباس و اختلاط میں مدغم نہ رہیں۔ جیساکہ مذہبیات کے دائرہ
میں عبادات اور شعائر مذہب جیسے صلیب کا بلند کرنا۔ عیسائی نماز دعاء استسقاء مجوس کا آگ
نکالنا وغیرہ ان سب میں امتیاز و تفریق پیدا کر دی گئی۔ اور ادھر معاشرۃ کے سلسلہ میں لباس

نام کُنیّت ۔ سواری ۔ سر کے بال ۔ کلام و تکلم وغیرہ میں ۔ تفریق و تمیز دیدی گئی ۔ پھر اسیطرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عام بلاد اسلامیہ میں ایک فرمان کے ذریعہ یہ حکم بھی جاری کیا تھا کہ۔

ولا یلبسو لبس المسلمین حتی یُعرفوا ؛	کفار مسلمانوں کا لباس نہ پہنیں تاکہ وہ اونسے الگ پہچانے جا سکیں

گویا قوموں کو باہمی معرفۃ و تمیز اسلام کا ایک اہم مقصد تھا جسپر اُسکے ابتدائی قرون میں کافی زور دیا جاتا تھا۔ اور یہ محض اسی لئے کہ ہر قوم اپنی قومیت پر باقی رہے ۔ اور اپنے ہی نام سے پکاری جا سکے۔ اور اسیطرح ہر قوم کی حق یا باطل خصوصیات جُدا جُدا دیکھی جا سکیں ۔ گویا جسطرح مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ کفار کیساتھ ظاہراً و باطناً تشبّہ نکریں تاکہ اسلامی اوضاع و اطوار ملتبس ہو کر مٹنے نہ پائیں اسیطرح حکومت اسلامی کفار کو بھی مجبور کرے گی کہ وہ کفر پر رہتے ہوئے مسلمانوں کا سا لباس نہ پہنیں تاکہ یہ کافرانہ ظلمت اپنی آمیزش سے اسلامی نور کو مکدر نہ بنا سکے ۔ ان مذکورہ فرامین فاروقی سے جہاں منع تشبّہ کے متعلق ایک پائیدار روشنی دستیاب ہوتی ہے وہیں نمایاں طور پر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد اپنی شوکت کو قائم کرنے کیساتھ ساتھ کفر کی عزّت و شوکت کو پامال کرنا بھی ہے کیونکہ اسکے نزدیک عزۃ و شوکت صرف حق اور اہل حق کے لئے ہے وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون ۔ اور ذلّت و پستی باطل کیلئے جو تمام ملل کفر میں منتشر ہے والکفر ملۃ واحدۃ وہ چاہتا ہے کہ زمین پر ایک خدا کا تخت عدالت بچھے اور ما انزل اللہ کا قانون نافذ ہو ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ۔ اُس کے نزدیک خدائی قانون کے سامنے منسوخ قوانین یا انسانی دساتیر کا بڑھنے کی سعی کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک حُسن مجسم کے سامنے کسی قبح مجسم کا دعوائے جمال کرنا یا ایک نور محض کے سامنے کسی ظلمۃ خالص کا چمکنے کی خواہش رکھنا ۔ پس کفر کے انہی غیر طبعی حوصلوں کو مٹا دینے کیلئے اُس نے تلوار بھی اٹھائی ۔ اور سلطنت و سیاست کے اصول بھی قائم کئے ورنہ اگر نفس کفر کو دنیا سے جبراً نابود کر دینا اس کا مقصد ہوتا تو لا اکراہ فی الدین اور افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین اور لست علیہم بمصیطر اور لست علیہم بوکیل کے کوئی معنی ہی نہ رہتے ۔ پس وہ کفر کو تو جبراً مٹانا نہیں چاہتا مگر شوکت

کفر کو جبراً مٹا دینا اسکی ایک فطری خواہش ہو۔ اور ایک ایسی ہی خواہش ہے جیسا کہ سچائی جھوٹ کو بے فروغ کر دینے کی خواہشمند ہو یا روشنی تاریکی کو بے وقعت بنا دینے کی آرزومند۔

پس مسلمان کیلئے ہر وہ فعل غیر فطری اور غیر شرعی ہوگا جس سے کفار کی کوئی عام وقعت قائم ہو۔ اُن کا اعزاز بڑھے۔ اور ان کی تائید ہونے کے سبب ان کے حوصلے بڑھ جائیں جنسے کفر یہ عزائم ترقی پذیر ہونے لگیں۔

اسی لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے فرامین کے ذریعہ عزت و شوکت کے تمام مراتب تو اسلامی شعائر کے لیے مخصوص فرما دیئے اور ذلت و پستی کے سارے ہی درجات کفر اور اہل کفر کیلئے۔ اور جبکہ اسلام کے یہ اہم مقاصد بہت زیادہ منع تشبہ ہی سے پورے ہو سکتے تھے تو سیاست فاروقی نے اسی اصول کو پیش پیش رکھکر جہاں مسلمانوں کو کفر کے بدترین شعائر کے اختلاط سے روکا وہیں کفار کو بھی بحالت کفر اسلام کے پاک شعائر سے الگ کر دیا۔ کیونکہ کسی جانب سے بھی تشبہ ہو۔ بہرحال تلبیس و عدم امتیاز کیلئے کافی ہے۔ اور عدم امتیاز ہی قومیتوں یا مذہبوں کیلئے مہلک اور تباہ کن وجود ثابت ہو چکا ہے۔

پس گویا منع تشبہ کا اصول جسطرح ایک سچے مذہب کی بقاء و تحفظ کا ضامن ہے۔ اسیطرح اسکی عزت و شوکت اور خودداری کے قائم رکھنے کا بھی کفیل ہوا اور اس لئے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسکی اہمیت اسلام کی نظر میں کیا ہوگی۔

ہاں مگر ساتھہ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ توہین و تذلیل اور چیز ہے اور ظلم و بے انصافی اور کچھہ ہے۔ اعزاز و تذلیل فرق مراتب پر مبنی ہوا اور ظلم و تعدی تعصب محض پر۔ پس اعزاز و تذلیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے مراتب نمایاں ہو جائیں۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ مسلمان حکام اس توہین و تذلیل کو سامنے رکھکر غیر مسلموں پر جور و تعدی بھی جائز تصور کرنے لگیں۔ ہرگز نہیں کبھی نہیں ہو سکتا کہ ذمیوں کو ذلیل سمجھکر ان کے جائز حقوق کو بھی جو بہ حیثیت رعایا ہونے کے وہ رکھتے ہیں پامال کر دیا جائے۔ کہ جانی و مالی حقوق میں وہ مسلمانوں کے ساتھہ مساوات رکھتے ہیں۔ کسی طرح جائز نہیں کہ اُن میں بدامنی پھیلائی جائے

کسی طرح روا نہیں کہ ان کے نزاعات میں صحیح اور منصفانہ فیصلہ نہ دیا جائے۔ کسی طرح مسلمانوں کو حق نہیں پہونچتا، کہ ان کے مال ومتاع پر ہاتھ ڈالیں۔ کسی طرح حلال نہیں کہ ان کو غیر معصوم الدم سمجھلیں۔ جسطرح اُن کے لئے یہ جائز نہیں کہ غیر مسلموں کو اعزاز واکرام میں مسلمانوں کا ہمسر کردیں۔ یا ان کی ایسی وقعت وعزت کرنے لگیں کہ کفر واہل کفر کی اہمیت اسلامی قلوب میں جاگزیں ہوجائے۔ پس انصاف بلا استثناء سب کے لئے ہے۔ اور عزت وعظمت صرف اللہ اور اہل اللہ کے لئے ہے۔

تشبّہ اور قرن تابعین

جس طرح خلافت راشدہ کے طریق سیاست اور عام صحابہ رضوان اللہ علیہم کے قبول و امتثال نے منع تشبّہ کی اس حبل المتین کو مضبوط تھامے رکھا اور اسطرح دنیا کو اپنے قرن کی برکات اور متحیر العقول کامیاب نتائج کے صفحات پڑھنے کا موقعہ دیا اسیطرح قرن ثانی میں اجلّہ تابعین نے بھی قرن اول کے بعد خلافت (راشدہ) کا پورا پورا عکس تابعین میں حضرت عمر بن عبد العزیز خلیفۂ عادل نے اپنے طرزِ عمل سے پیش کیا اور اسی نوع کی سعادات و برکات سے دنیا کو متمتع ہونے کا موقع دیا جو قرنِ اول کے مخصوص و ممتاز نشانات تھے۔ تفریق حق و باطل۔ امتیاز حسن و قبیح ہیں انہوں نے پورا زورِ خلافت صرف کیا۔ اور کھرے کو کھوٹے سے الگ رکھا۔ شدۃ علی الکفار اور شفقۃ علی المسلمین کا قرآنی اصول ان کا ہر ساعۃ راہنما رہا۔

ذیل کا واقعہ ان کے امتیاز آفرین طرزِ عمل تقشف فی الدین صلابت فی الاسلام اور منع تشبّہ کے اصول کی غیر معمولی پابندی کا شاہد عدل ہے۔ اس عمر ثانی نے بھی انہی جزئیات میں پیش قدمی کی جن میں عمر اول نے کی تھی۔ رضی اللہ عنہما و رضینا عنہ۔

دخل ناس من بني تغلب على عمر بن عبد العزيز وعليهم العمائم كهيئة العرب فقالوا يا امير المؤمنين الحقنا بالعرب قال فمن انتم قالوا نحن بنو تغلب قال اولستم من اواسط العرب قالوا نحن نصارى قال عليّ بجلم فاخذ من نواصيهم والقى العمائم وشق رداء كل واحد شبرا يحتزم به وقال لا تركبوا السرج واركبوا على الاكف ودلوا ارجلكم من شق واحد

بنی تغلب کے کچھ لوگ عمر بن عبد العزیز کے پاس حاضر ہوئے جو عربوں کے مانند عمامے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہمکو عربوں ہی میں شمار کر لیجئے (یعنی اہل عرب کے سے حقوق دیجیئے) فرمایا تم کون لوگ ہو؟ عرض کیا کہ ہم بنی تغلب ہیں۔ فرمایا کہ کیا تم عربوں میں سے نہیں ہو؟ (یعنی ظاہری لباس وغیرہ تو تمہارا تمکو عرب بتلا رہا ہے) عرض کیا کہ نہیں ہم نصاریٰ ہیں۔ فرمایا کہ میری قینچی لائی جائے۔ سو اسیوقت

ان کی پیشانیوں کا طرہ کاٹ دیا۔ ان کے عمامے گرا دئے۔ اور ہر ایک کی چادر میں سے بالشت بھر چوڑی پٹی اتار کر تاکہ ان کی کمروں میں پٹکے کی طرح باندھ دی جائیں" جو نصاری کا خاص امتیازی شعار تھا اور عربوں سے ان کو متمیز کرتا تھا۔ پھر فرمایا کہ زینوں پر مت سوار ہو بلکہ پالانوں پر اور سوار ہو کر اپنے دونوں پیر ایک طرف لٹکا لو"

اس فرمان سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں جنکا اہتمام اپنے عہد میں حضرت عمر ثانی نے فرمایا۔ ایک امتیاز۔ اور قطع مشابہت کہ مسلمان اور نصرانی باہم ممتاز رہیں۔ چونکہ خیر کا دور دورہ تھا اور مسلمانوں کے اقتدار و عروج کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اسلئے مسلمانوں کے قلوب تو تشبّہ بالنصاری سے یکسر خالی تھے۔ لیکن طبعی طور پر فطرۃً مفتوح قومیں فاتح کی ہر روش پر مائل ہوتی ہیں اسلئے نصاری چاہتے تھے کہ عربوں کا لباس پہنیں۔ عمامے باندھیں۔ اپنے زنار اور پٹکے کھولکر مسلمانوں کی وضع و تراش اختیار کریں۔ طرہ اور سر کے بال رکھیں۔ پس مسلمانوں کی طرف سے تو تشبّہ کا دروازہ بند تھا لیکن غیر مسلموں کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ نصرانی صورۃً عرب بنکر تلبیس کے ذریعہ اپنے مذہبی و سیاسی حقوق اہل حق کے سے قائم کرنے کی تدابیر عمل میں لائیں اسلئے حضرت عمر ثانی نے پیش بندی کر دی۔ فرمان بھی جاری کر دیئے اور عملاً اسی مجلس میں عربیّت کے امتیازی نشانات بھی نصرانیوں سے چھین لئے۔

دوسرے یہ کہ اس امتیاز اور قطع تشبّہ سے جہاں انہوں نے اسلام کی شوکت قائم کی وہیں کفر کی شوکت کو پست بھی کر دیا۔ جیسا کہ طرہ کاٹ دینے پالان پر چڑھنے کا حکم دینے سواری پر دونوں پیر ایک طرف لٹکا کر سوار ہونے کا حکم دینے سے ظاہر ہو رہا ہے۔

پھر فراشن کے ذریعہ اسی قسم کے اور بھی تعزیری احکامات اس خلیفہ عادل نے قلمرو مملکت اسلامیہ میں شائع کر دیئے۔ معمر کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے صوبہ کے ایک عامل (گورنر) کو یہ فرمان لکھا کہ۔

اپنی نواح میں ممانعت کردو کہ کوئی نصرانی قبا	ان امنعہم من قبلک فلا یلبس نصرانی

قباء ولا ثوب خز ولا عصب وتقدم في ذلك اشد التقدم واكتب فيه حتى لا يخفى على احد نهي عنه وقد ذكر لي ان كثيرًا من النصارى قد راجعوا لبس العمائم وتركوا لبس المناطق على اوساطهم واتخذوا الوفر والجمام وتركوا التقصيص ولعمري ان كان يصنع ذلك فيما قبلك ان ذلك بك ضعف وعجز فانظر كل شيء كنت نهيت عنه وتقدمت فيه الا تعاهدته واحكمته ولا ترخص فيه ولا تعد عنه شيئًا (اقتضاء)۔

عصب اور ریشمین کپڑا (جو محض مفاخرت کی چیز ہے) اور چھال کا کپڑا نہ پہنے ۔ اسکے نفاذ کے بارے میں شدت کے ساتھ پیش قدمی کرو ۔ اس حکم کو لکھکر شائع کردو تاکہ کسی پر ان باتوں کی ممانعت مخفی نہ رہجائے ۔ مجھے ذکر کیا گیا ہے کہ نصاریٰ پھر عمامے باندھنے لگے ہیں اور انہوں نے اپنی کمروں پر پٹکے (جو ان کا مخصوص نشان ہے) باندھنا چھوڑ دیا ہے ۔ اور سر پر بال اور پٹے رکھنے لگے ہیں اور بال کٹوانا چھوڑ دیا ہے ۔ خدا کی قسم اگر یہ سب کچھ تمھارے علاقہ میں ہو رہا ہے تو یہ تمھارا کھلا ہوا ضعف اور عجز ہے ۔ پس ان ہدایات میں سے کسی بات کو اسکے سوا مت چھوڑو کہ اس کی کافی نگرانی اور استحکام کر دو اور ڈھیل مت دو ۔ مگر کسی پر تعدی وظلم بھی مت کرو ۔"

اس فرمان وحکم کا حاصل وہی ہے جو قصۂ بنی تغلب کا حاصل تھا ۔ یعنی امتیاز ، اور ترک تشبہ کو پختہ بنانا اور التباس وتشبہ کو جو قوم کے ملی وقومی وجود کو باطل کرتا ہے ۔ فنا کرنا ۔ کل آتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ منع تشبہ پر قرن اول وثانی میں یکساں زور دیا گیا ہے اور ان قرون میں اسپر زور دیا جانا ہی اسلامیت کے عروج اور کفر واہل کفر کی پستی وکمزوری کا باعث ہوتا رہا ہے ۔

تشبہ اور قرون اجتہاد

تبع تابعین سے عموماً ارباب اجتہاد و آئمہ مستنبطین کا دور شروع ہوتا ہے جو ارباب مذہب ہوئے اور جنکا دامن سنبھالکر مخلوق نے اپنے دین کو اختلاف و تضاد اور ہوائے نفس سے بچایا۔ اس قرن میں بھی تشبہ کی اہمیت وہی رہی جو پچھلے قرون خیر سے ہوتی آرہی تھی۔ یعنی مذاہب اربعہ نے منع تشبہ کی پوری روک تھام کی۔

حنابلہ | حنبلیوں کا مسلک حافظ ابن تیمیہ کی کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" سے بھی واضح ہے نیز دمیاطی حسن السیر میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے حنابلہ کی مشہور کتاب الانتصار سے ان کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے۔

من تزیا بزی کفار من لبس غیار او شد زنار او تعلیق صلیب بصدرہ حرم ولم یکفر	جس نے کفار کی سی ہیئت بنائی کہ زنار باندھ لیا یا چھاتی پر صلیب لٹکالی تو حرام فعل کیا مگر کافر نہوا۔

بہرحال تشبہ بالکفار کی حرمت صراحۃً ثابت ہوتی ہے جبکہ ان کے شعائر اور مخصوص نشانات کے ساتھ تشبہ کیا جائے۔

مالکیہ | مالکیہ اس میں بہت زیادہ آگے ہیں۔ انکے مسلک پر تشبہ اور مشابہۃ بالکفار کے علاوہ یہانتک سخت گیری اور تحفظ ہے کہ عربی کے سوا عجمی زبانوں میں حلف اٹھانا ان کی سی دعائیں مانگنا ان کی زبان میں ذکراللہ اور عبادت کرنا بھی ممنوعات میں سے ہے۔ حتی کہ بنقل حافظ ابن تیمیہ ان کے یہاں کفار کی عیدوں اور میلوں وغیرہ کے ایام میں ایک بطیخ ذبح کرنا مسلمان کیلئے خنزیر ذبح کرنے کا مرادف ہے۔ مالکیوں کی مشہور کتاب "مختصر الخلیل" میں بنقل دمیاطی یہ تصریحات موجود ہیں۔

کفر المسلم بصریح کقولہ عزیر ابن اللہ او لفظ یقتضیہ کقولہ اللہ تحیزا و فعل یتضمنہ	اگر مسلمان صراحۃً یہ کہدے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں یا کوئی لفظ ایسا بولے جو اللہ تعالیٰ کی

کشد زنار ونحوہ مما یختص بالکافر کلبس برینطۃ نصرانی۔

جسیمۃ اور محدود ہونیکا مقتضی ہو جیسے اللہ ایک خاص مکان میں ہے یا کوئی ایسا فعل کرگذرے جو اسلام کے خلاف کفر کی ممتاز علامت ہو، جیسے زنار باندھ لینا یا نصرانی کی ٹوپی اوڑھ لینا تو وہ مسلمان کافر ہوگیا "

شوافع | حافظ ابن حجر قواطع الاسلام میں (بنقل دمیاطی) لکھتے ہیں کہ۔

وحیث لبس زی الکفار سواء دخل دار الحرب ام لا بنیۃ الرضا بدینہم او المیل الیہم او تھاونا بالاسلام کفر

اور جب کفار کا سا لباس پہن لیا (خواہ دار الحرب میں داخل ہو یا نہو) انکے دین سے راضی ہو کر یا ان کیطرف میلان خاطر کرکے یا اسلام کے ساتھ تھاون کرکے (اسلام کو ہلکا سمجھکر) تو وہ کافر ہوگیا۔

حنفیہ | حنفیہ بھی اس مسئلہ میں بہت زیادہ متشدد ہیں۔ خادمی اور ہندیہ کی عبارت حسب ذیل ہے

یکفر بوضع قلنسوۃ المجوس علی راسہ علی الصحیح۔

مجوس کی ٹوپی سر پر رکھنے سے کافر ہو جائیگا قول صحیح کے اعتبار سے۔

بہر حال مذاہب اربعہ تشبہ بالکفار کی حرمت وممانعت کا اعلان کر رہے ہیں ہاں ان جزئیات پر یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ اگر ایک شخص نے نصرانی یا مجوسی ٹوپی پہن لی یا زنار اپنے سینہ پر لٹکا یا یا کفار کی عام وضع بھی اختیار کرلی تاہم جبکہ وہ توحید ورسالت کا صراحۃً منکر نہیں جنت ونار پھر اور معتقدات اسلامی اور ضروریات دین کا علی الاعلان انکار نہیں کرتا تو کوئی وجہ نہیں کہ محض اس ظاہری تغیر سے اسکے عام قلبی روش پر کفر کا حکم کردیا جائے۔؟ اس سوال کے جواب میں ہم صرف قاضی بیضاوی کی وہ عبارت پیش کر دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے سورہ بقرہ کی تفسیر کرتے ہوئے ایک موقع پر درج کی ہے۔

وانما عُد لبس الغیار وشد الزنار ونحوھما کفرا لانہا تدل علی التکذیب فان من صدق الرسول علیہ السلام لا یجترئ

یہ جو غیار کا پہننا یا زنار باندھنے اور اسی کی مانند دوسری حرکات کرنے کو کفر کہا گیا ہے سو اسلئے کہ یہ چیزیں اس شخص کی تکذیب کی علامت ہیں کیونکہ جس نے رسول علیہ السلام کی

علیہا ظاہراً الا لانہا کفر فی نفسہا۔ | تصدیق کی وہ بظاہر ان چیزوں کی جرأت نہیں کرسکتا، تو یہ کہ یہ چیزیں

اس سے واضح ہوگیا کہ حقیقۃً یہ اشیا، یا یہ افعال کفر کے نہیں اسلئے اگر استہزا نہ کرے تو جائز ہی
مگر پھر بھی اس تشبہ کو اس لیے کفر کہا گیا ہی کہ کسی شخص کو علی الاعلان اور بسر مخلوق ان چیزوں کے
استعمال کی جرأت ہونا بلاشبہ اسکی دلیل ہے کہ اسکے قلب میں اسلامی اوضاع واطوار کی
کوئی وقعت واہمیت نہیں۔ بلکہ اسکے بالمقابل کفریہ اشیاء کی رغبت ومحبت موجود ہے اور جبکہ
ایک شخص کفر کے شعائر اور اسکی مخصوص علامات پر رغبت کے ساتھ اتر آیا تو کفر تک پہنچنے میں جا نہیں
اس کیلئے حائل ہی کیا رہ گیا۔ اسی لیے بعض حنفیہ نے صریح کفر کے اقوال پیش کئے ہیں اور بعض
نے امارات کفر کے تاہم اگر تشبہ بالکفار کو امارات کفر سے بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی وہ ایک
پوست ہے جس کا مغز کفر ہے جو اسمیں مستور ہے۔

صوفیاء | صوفیاء کرام مقربان بارگاہ الٰہی ہیں اور خواص حق میں سے ہیں۔ اسلئے وہ لوگ
عام قانون شریعت کی تیسیرات وتسہیلات اور اس عام قانونی زندگی سے (جو عوام وخواص
پر یکساں حاوی ہے) کچھ آگے ہیں۔ کیونکہ اُن کا دستور العمل خاص نبوۃ کی زندگی ہے۔ اور وہ حیات
ابوذری کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

وہ تشبہ بالغیر کے بارے میں جسقدر بھی متشدد ہوں کم ہوں۔ اُن کے اصول پر تو شاید
بہت سی وہ اوضاع واطوار جو ٹھیک ٹھیک منہاج نبوۃ پر نہیں اُترتیں گو عام قواعد شریعت کے
اعتبار سے خلاف شرع بھی نہوں عجب نہیں کہ منع تشبہ کے اصول سے روکی جائیں۔ اور
شاید کہ بہت سی وہ چیزیں کہ فتویٰ اپنی تسہیلات سے انکو حلال کہہ سکتا ہو اُن کا تقویٰ پھر بھی
اسے ممنوع قرار دیگا۔ اسی لیے اُن کی تصریحات یہانتک تحفظ حدود کرتی ہیں کہ صرف عرب
ہی کی زی وہیئت میں ایک مسلمان کو محصور ہوجانا چاہیے۔ کہ وہ ہی زیّ نبوۃ ہے۔ بقیہ عرب کے
سوا تمام اوضاع واطوار عجمی اشیاء ہیں جو قابل ترک ہیں۔ حضرت راس الاصفیاء ابو محمد شیخ
عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

چونکہ یہ کلما خالف زیّ العرب وشابہ زیّ العجم (اقتضاء الصراط المستقیم)	اور مکروہ ہے جب بھی ہیئت عرب کی مخالفت پائی جائے اور ہیئت عجم کی مشابہت۔

پس ترک تشبہ کی تعلیم سب سے اول قرآن نے دی۔ پھر احادیث نے اسکی تفصیل کی پھر صحابہ نے اسکی تعمیل کی پھر علماء ظاہر (ائمہ اجتہاد وغیرہم) اور علمائے باطن (صوفیا کرام) رحمہم اللہ نے اسکی علمی و عملی تائید کی۔ پھر وہ ایک نقلی یا محض اسنادی چیز نہیں رہ گئی، بلکہ عقل سلیم نے اسکو بطوع و رغبت قبول کیا۔ تو اس اصول میں جو قرآنًا حدیثًا، آثارًا، فقہًا، عرفًا، اور خلاصہ یہ کہ عقلًا و نقلًا ثابت اور منضبط ہو چکا ہو۔ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم نے انتہائی اہتمام سے حدود اسلامیہ میں اس کا اجرا کیا ہو۔ اور امتہ اسلامی کا قدیمًا و حدیثًا اسپر اجماع ہو چکا ہو۔ کیا اس صدی کے اسلامی افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں؟ اور کیا مسلمانوں کے لئے اسلام کے اس سچے اور پاک اسوہ میں کوئی حظ و نصیب نہیں؟ میں نہیں کہتا کہ نہیں! لیکن پھر مسلمان اپنے عمل سے اس کا جواب دیں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ اس اسوہ کی تائید میں کوئی علمی اقرار کریں اپنے عمل سے غیر اقوام کے سامنے اسکو مضبوط بنائیں کہ درحقیقت یہی ضبط و قوۃ اسلام کی قوۃ ہے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ اسلام کی ان تصریحات کے موافق ہر قسم کی موافقت اور مشابہت کفر کو مٹا دیں کیونکہ مخالفت کفر خود بالاستقلال اسلام کا ایک زبردست مقصد ہے۔ ہاں پھر بہت ہی زیادہ خصوصیت لئے ہوئے میرا روئے سخن اپنی ہم قوم جماعت طلبائے علوم اسلامیہ سے ہے کہ وہ خدارا اس صدا کو صدا بہ صحرا نہ سمجھیں۔ یہ حکمت حقیقتہً انہی کی گم کردہ متاع جان فروز ہے، انہی کی استقامت پر عالم کی استقامت اور انہی کی زلّت پر کائنات کی زلّت ہ بہر حال معلق ہے۔ وہ عالم کے ستون ہیں اسلئے اگر وہ تھوڑی سی حرکت کرینگے تو قصر عالم مضطرب ہو کر بالکل روبہ انہدام ہو جائیگا۔ ؎

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا		
فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص		

اُن کا نیم جو ظلم مخلوق کے لئے ہزاروں فسوق و فجور کے لئے ایک دعوت و صلاءِ عام ہوگا ۔

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد
زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ

--------•(※)•--------

فصل

کیا اسلام کی تمامتر بنیاد مخالفت کفر پر ہے؟

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام کی تمامتر بنیاد اغیار کے خلاف ہی پر قائم ہے؟ کیا فی نفسہ اسلام کی کوئی محصّل اور قائم شدہ حقیقتہ نہیں ہے؟ کیا اسکے وجود و ہستی کا خلاصہ یہی ہے کہ اغیار جو کچھ کریں تم ان کا خلاف کرو کہ یہی تمہارا اسلام ہے۔ مثلاً اگر مشرکین عرب ایک خاص طریقے سے حج کرتے تھے تو کیا اسلامی حج صرف یہی ہے کہ ان کے خلاف ایک خاص ترمیم سے افعال حج جدا تجویز کر دیئے جائیں۔ اور ان سے اسلام کا وجود قائم کر دیا جائے؟ اگر اسلام کی حقیقت یہی ہے تو حقیقتہً اسلام ایک بے حقیقت چیز ہو جاتی ہے کیونکہ اصل وجود تمام مذاہب کے لیے ہو جاتا ہے اور اسلام کی تعمیر محض مذاہب کی رد و جرح اور ملل کی قطع و برید پر قائم ہو جاتی ہے اور یہ کوئی حقیقی وجود نہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال محض ایک مغالطہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں اسلام کی بنیاد کفر کے خلاف پر نہیں بلکہ کفر کی تعمیر اسلام کے خلاف پر قائم کی گئی ہے۔ اسلئے اسلام نے کسی ملت کا خلاف نہیں کیا بلکہ تمام ملتیں اسلام کے خلاف پر قائم کی گئی ہیں۔ کشجرۃ خبیثۃ اجتثت من فوق الارض مالہا من قرار۔

عالم ازل میں جبکہ آدم و ابلیس کا مذہب ایک تھا کون تھا جس نے پہلے خلاف کی بنیاد قائم کی اور اسلام و استسلام کے بالمقابل انا خیر منہ کا علم استکبار و جحود بلند کیا۔ یقیناً وہ ابلیس تھا نہ کہ آدم۔ کیونکہ آدم نے تو ربنا ظلمنا انفسنا کہکر اپنی عبدیت و بندگی اور اپنے اسلام حقیقی کا ثبوت پیش کیا تھا۔

پس ابلیس ہی نے اس اسلام و طاعت کے خلاف ایک مذہب بنایا جس کی اساس نفس

پرستی۔ کبر و رعونت اور داعیۂ انا خیر منہ تھی۔

اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ روز ازل ہی میں مبلغ کفر کی بنیاد اسلام کے خلاف پر قائم ہوئی نہ کہ اسلام کی بنا خلاف کفر پر۔

پھر زمین پر اتر کر بھی آدم علیہ السلام تو اپنے اُسی عبدیت کیش اسلام پر قائم رہے جو آسمان سے اپنی ساتھ لائے تھے۔ اور ابلیس اسی کافرانہ خلاف پر جما رہا۔ جو آسمانوں میں کر چکا تھا۔ پس عالم ازل کی طرح دنیا کی ابتدائ آفرینش میں بھی محصل حقیقت اسلام ہی کے لیے رہی۔ اور خلاف بالقطع و بُرید صرف کفر کیلئے۔

پھر آدم کی اولاد میں بھی جب کفر کی بنا قائم ہوئی تو اسلام کے خلاف پر کیونکہ مذہب آدم کے خلاف قابیل ابن آدم کی ساتویں پشت میں پہلا انسانی کفر ظاہر ہوا۔ جس کے مقابلہ کیلئے نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور انہوں نے اس قوم کو یہ کہکر اپنی موافقت پر بلایا کہ میں مسلم ہوں

وامرت ان اکون من المسلمین۔ | میں اسپر مامور ہوں کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔

اگر یہ قوم اسلام آدم سے نہ پھری ہوتی اور اسلام کے خلاف اُسنے کوئی نیا مذہب نہ قائم کرلیا ہوتا۔ تو پھر اس کیلئے دعوت اسلام کی ضرورت ہی کیا رہتی؟۔

پس یہ ثابت ہوا کہ آدم کے بعد دنیا کے اس سب سے پہلے پیغمبر اور مبلغ اسلام کے دور میں بھی اصل حقیقت اسلام ہی کے لئے تھی، اور کفر کی حقیقت اسکے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ اسلام کے خلاف [illegible] تھا۔

پھر [illegible] سے عہد ختم نبوۃ تک جتنی بھی ائمۃ الکفر اسلام کے خلاف اپنے [illegible] صورتوں میں شائع کرتے رہے ویسے ویسے اسلام ان کا مقابلہ کرتا رہا [illegible] اور اس خلاف کی تاریکی انتہا کو پہنچ جاتی تھی۔ جب ہی حسب ضرورۃ دنیا میں نبوت کی روشنی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجی جاتی تھی۔ لیکن ہر ایک نبی اسکا [اقرار] کرتا تھا کہ وہ مسلم ہے اور وہی اسلام لیکر دنیا میں آیا ہے جس سے ہٹکر اسکی قوم نے کفر

مذہب قائم کر لیا تھا۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی قوم نمرود کے مقابلہ پر یہی دعویٰ کیا کہ میں مسلم ہوں اور اسی قدیم اور اصلی مذہب پر قائم ہوں جو بعینہ آدم و نوح کا مذہب تھا، قرآن نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا۔

اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین ۔	جبکہ ابراہیم سے ان کے رب نے فرمایا کہ اسلام لا تو انہوں نے کہا کہ میں رب العالمین کیلئے اسلام لا چکا ۔

بنا رکعبہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے اسی اسلام پر پختہ رہنے کی دعا کی جس سے حضرت اسمٰعیلؑ کا اسلام ثابت ہوا ہے۔

ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک ۔	اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا مسلم اور ہماری اولاد کو اپنی امۃ مسلمہ فرمائیے۔

پھر حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو آخری وصیۃ ہی یہ کی تھی کہ تم اسلام پر مرتے دم تک جمے رہنا۔

ووصی بہا ابراہیم بنیہ ویعقوب یٰبنی ان اللہ اصطفیٰ لکم الدین فلا تموتن الا وانتم مسلمون ۔	اور اسی کا حکم کر گئے ہیں اپنے بیٹوں کو ابراہیم اور یعقوب بھی اے میرے بیٹو اللہ نے اس دین کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا

اور نبی یعقوبؑ نے اپنے مسلم ہونے کی کھلی شہادت یوں دی کہ۔

قالوا نعبد الٰہک والٰہ آبائک ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق الٰہا واحدا ونحن لہ مسلمون۔	انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسی کی پرستش کرینگے جسکی آپ اور آپکے بزرگ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کرتے آئے ہیں یعنی وہی معبود جو لاشریک ہے اور ہم اسی کے اسلام (اطاعت) پر رہیں گے۔

یوسف علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ۔

توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین۔	مجھکو پوری فرمانبرداری (اسلام) کی حالت میں دنیا سے اٹھالے اور مجھکو خالص نیک بندوں میں شامل کرے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کیا تھا۔ کہ

یا قوم ان کنتم آمنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین۔	اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلم (مطیع) ہو۔

انبیاء توراۃ مثل یحیٰی و زکریا علیہما السلام وغیرہ کیطرف بھی قرآن نے اسلام ہی کو منسوب کیا ہے۔

انا انزلنا التورٰیۃ فیھا ھدًی و نورٌ یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا۔	ہم نے توریت نازل فرمائی جس میں ہدایت تھی اور نور تھا انبیاء جو کہ اللہ تعالیٰ کے مطیع (مسلم) تھے اسکے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے۔

سلیمان علیہ السلام نے جب بلقیس کو نامہ بھیجا تو اسمیں لکھا تھا۔

ان لا تعلوا علیّ وأتونی مسلمین۔	تم لوگ میرے مقابلہ میں تکبر مت کرو اور میرے پاس مطیع (مسلم) بنکر چلے آؤ۔

پھر بلقیس جبکہ ایمان لائی ہیں تو انہوں نے مذہب اسلام قبول کیا اور کہا۔

انی ظلمت نفسی واسلمت مع سلیمان للہ رب العلمین۔	میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا اور میں سلیمان کے ساتھ ہوکر رب العلمین کے لئے اسلام لائی۔

عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے اپنے اسلام پر اللہ کو شاہد بنایا تھا جبکہ اللہ نے انکو الہام کیا کہ وہ اس کے دین میں داخل ہوں۔

واذا وحیت الی الحواریین ان آمنوا بی وبرسولی قالوا آمنا واشھد باننا مسلمون	اور جبکہ میں نے حواریوں کو حکم دیا کہ تم مجھپر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور آپ شاہد رہیے کہ ہم مسلم ہیں۔

اور بالآخر آخری پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اعلان فرما دیا کہ۔

قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ وامرنا	آپ کہدیجئے کہ یقینی بات یہ ہے کہ راہ راست وہ خاص

بلیسلم لرب العالمین ۔	اللہ ہی کا راہ ہے ۔ اور ہمکو یہ حکم ہوا ہی کہ ہم پروردگار عالم کیلئے مسلم ہو جاویں ۔

ایک جگہ حق تعالے نے عام منادی فرمادی کہ ۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔	دین خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے ۔

اور فرمایا ۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ	اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا

اور پھر حدیث نبوی نے اس برگزیدہ طبقہ (انبیاء) کے وحدۃ دین کی اس آیت کے ماتحت یہ توضیح کی کہ تمام انبیاء اگرچہ صراحۃً کتنوں ہی کا قرآن ذکر بھی نہیں کیا ان سب کا دین ایک ہی اسلام رہا ہے ۔

نحن معاشر الانبیاء دیننا واحد والانبیاء اخوۃ العلات (اوکما قال) ۔	ہم انبیاء کی جماعت ہمارا دین ایک ہے ۔ اور ہم وحدۃ دین کے لحاظ سے ایسے ہیں جیسے علاتی بھائی کہ باپ کا ایک ہو

اور اسی لئے قرآن کریم نے متعدد آیات میں بتلایا ہی کہ ایک نبی کی تکذیب تمام انبیاء کی تکذیب ہے کیونکہ سب کا دین اور صراط مستقیم ایک ہی تھا اور اسی لئے ہر ایک نبی نے اپنی تصدیق کیساتھ ساتھ اپنے ماقبل ومابعد انبیاء کی بھی تصدیق کی اور اپنی قوم سے کرائی ہے ۔

بہر حال آدم سے بلکہ عالم ازل سے لیکر عہد ختم نبوۃ تک اُصولاً ایک ہی دین ہے جس کا نام اسلام ہے ، اُسکے پیرائے ۔ اُسکی قبائیں حسب عمر اور اسکی شرائع حسب اقوام بدلتی رہی ہیں لیکن سب میں ضوء افشانی اسی ایک دین کی رہی ہے ایک ہی بحر بے پایاں ہے جس نے اپنا زلال حیات مختلف نہروں کے ذریعہ تقسیم کیا ہی اور ایک ہی پیکر رعنا ہے جو مختلف قبائیں پہنکر رونما ہوا ہے

بحر یست متحرکہ باشکال مختلف مشتق چو نیک در نگری عین مصدر است	باراں و قطرہ و صدف و گوہر آمدہ کیں در صفات ظاہر خود مضمر آمدہ

اور اسلئے پچھلے ادیان حقہ (سماویہ) کو اسلام سے کوئی بھی اجنبیت نہیں ہی بلکہ ہر سچا مذہب اسلام ہی کا ایک مظہر تھا جسمیں اسلام نے اپنی کسی خاص شان سے اپنی نمائش کی تھی ۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آن	ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

عربی کے ایک شاعر نے اسی حقیقت کو دکھایا کہ اگر کثرۃ میں وحدۃ کی نمائش ہو تو کثرت کی تعداد سے وحدۃ باطل نہیں ہو سکتی کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ

وما البحر الا الموج لا شئ غیرہ	وان فرقتہ کثرۃ المتعدد

اور اسلئے یہی دین سب سے پہلے عالم میں ظاہر ہوا۔ پس جسقدر بھی باطل مذاہب پیدا ہوئے وہ اس دین کے خلاف کرنے اور اس سے مقابلہ ٹھاننے میں نمودار ہوئے ہیں۔ اس لئے اسلام کی بنیاد عہد آدم سے عہد نبوی تک کسیطرح غیر مذاہب کے خلاف پر نہیں۔ بلکہ تمام مذاہب باطلہ کا سنگ بنیاد اسلام کے خلاف پر رکھا گیا۔ پس اگر اسلام غیر مذاہب سے تشبہ منقطع کرتا اور ان کی موافقت سے ہٹا کر صرف اپنی موافقت پر مجبور کرتا ہے۔ تو اسکے یہ معنی تو ہو سکتے ہیں کہ اسلام اپنے ہی خلاف سے روکتا ہے کہ اس کا وجود مستقل ہے اور اسکے سوا تمام مذاہب کا وجود محض خلافی اور غیر مستقل ہی نہ یہ کہ وہ دوسروں کے خلاف سے اپنا وجود کسب کرتا اور دوسرے خرمنوں کا خوشہ چین ہے۔ نہیں بلکہ دنیا کے ہر خرمن خاشاک ہیں اگر کوئی پر مغز دانہ ہے تو اسی خرمن کا ہے۔ اگرچہ چور اپنی سارقانہ کارروائیوں کا اقرار نکریں۔

قمریاں پاس غلط کردہ خودی دارند	ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندازہ تو نیست

پس کسقدر حیرتناک اُن لوگوں کا رویہ ہوگا جو اسلام کے مستقل شعبوں کو چھوڑ کر کفر کے بے جڑ اور مُضر شعبوں کو اپنا دستور العمل قرار دیں۔ اور مشابہتہ نبوی کو ترک کرکے مشابہت شیاطین (من الجنۃ والناس) کو اختیار کریں۔ ایسوں ہی کی شکایت اُن کے رب کی ہے۔

جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

ان اللہ اظہر الشکایۃ من امتی وقال ان طائفۃ من امتی لا یعلمون فہم یعصونی ویطیعون الشیطان	اللہ تعالیٰ نے میری امت میں سے بعض کی شکایت کی اور کہا کہ میرے نے شیطان انکو مجھ سے چھوڑا۔ اور وہ میری

نظر دوست نادر کند سوئے تو	چو در روئے دشمن بود روئے تو
ندانی کہ کمتر نہد دوست پائے	چو بیند کہ دشمن بود در سرائے

فصل

تشبہ کے فقہی مراتب

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ منع تشبہ کا حقیقی مقصد ملت اسلامی کو التباس و تباہی سے بچانا اور مسلم و غیر مسلم میں کلی انقطاع کر دینا ہے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ پھر بھی منع تشبہ کا منشا مخلوق کو تنگی اور حرج میں ڈالنا یا عام طبعی اور قدرتی جذبات کو پامال کر دینا نہیں۔ بلکہ وہ امتیاز کو باقی رکھتے ہوئے بعض مراتب عمل میں اشتراک اور بلکہ کتنے ہی قدرتی امور میں تشابہ کا بھی تحمل کر سکتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم تشبہ کے مراتب کا وہ فقہی نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے تشبہ کے جواز و عدم جواز۔ حرمت و کراہت استحسان و عدم استحسان۔ اور امکان و عدم امکان کی تفصیلات پورے طور پر واضح ہو جائیں گی۔

انسانی امور کی عقلاً دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اضطراری اور اختیاری۔ اضطراری امور وہ ہیں جن کے ایجاد و اعدام میں انسانی اختیارات کو کوئی دخل نہیں۔ مثلاً انسان کی ذاتی اوضاع و اطوار۔ اور جبلی اقتضاءات یعنی اس کے اعضاء بدن۔ چہرہ مہرہ۔ پھر اس کے ذاتی عوارض بھوک پیاس لگنا اور اس اندرونی داعیہ سے کھانے پینے پر مجبور ہونا۔ شہوت نفس یا تن پوشی کا فطری داعیہ۔ اس کا قدرتی طور پر مدنی الطبع بنکر پیدا ہونا۔ اس کا اچھے برے کی معرفت و تمیز پر مفطور ہونا وغیرہ یقیناً اس کے اختیاری امور نہیں۔ اگر وہ منانا چاہے تب بھی یہ جذبات اس کے دل پر ہجوم کرتے رہیں اور عمل کے جامے میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ اسی وقت سے ان جذبات کو لئے ہوئے ہوتا ہے جبکہ اختیار و عدم اختیار کی حقیقت بھی اس کے دائرۂ فہم میں نہیں ہوتی۔

اضطراری امور

ظاہر ہے کہ ایسے امور میں تصرف کرنے کے لئے شریعت اسے کوئی خطاب نہیں کر سکتی۔ یعنی یہ امور اگر مسلم و کافر میں مشترک ہیں تو منع تشبہ کے ذریعہ اس اشتراک کو

مٹانے کی کوئی سعی نہیں کی جائیگی۔ نہیں کہا جائیگا کہ اگر غیر مسلم کھاتے پیتے ہیں تو مسلم انکے خلاف ترک تشبہ کے ذریعہ بھوکا مرجائے۔ یا وہ ناک کان رکھتے ہیں تو یہ کاٹ ڈالے اور وہ اگر انسان ہیں تو یہ لایعقل جانور ہوجائے۔ کیونکہ مسلم و کافر کا یہ جبلی اشتراک یا عدم امتیاز جبکہ قدرتی ہے تو نہ انسان اُس کے مٹانے پر قادر ہی ہے اور نہ اُس کے باقی رہنے میں ضیاع حدود یا تخریب حقائق کی کوئی مضرۃ ہی ہے۔ انسان کے بس ہی میں نہیں کہ وہ انسان نہ رہے بلکہ گدھا بنجائے یا حساس اور نامی نہ رہے بلکہ اینٹ پتھر ہوجائے۔ اور جبکہ انواع کی یہ قدرتی حدود اِس درجہ مضبوط یا ایسا اور حد معین و قدر معلوم پر ہیں کہ انسان کی کوئی ارادی حرکت نہ انھیں مٹا سکتی اور نہ اُن میں تلبیس کرسکتی ہے کہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ تو پھر ترک تشبہ کے ذریعہ ایک ناممکن التباس کی روک تھام کرنے کی تکلیف دیا جانا بلاشبہہ عبث اور خلاف حکمۃ امر ہوگا۔ جس سے خدا اور اُسکی پاک شریعت بری ہے۔

پس شریعت اسلامی اپنے اوامر و نواہی کے ذریعہ انسانی افعال کی تہذیب و شائستگی تو کریگی لیکن اُن امور میں انسان کو کوئی خطاب نہیں کرے گی جو براہ راست خدا کے قوائے مدبرہ سے انصرام پا رہے ہوں۔

وہ یہ حکم تو نہ دیگی کہ تم تشبہ بالغیر کے خوف سے کھانا پینا ترک کردو کہ غیر مسلم بھی ایسا کرتے ہیں کیونکہ یہ تمھارا اکتسابی عمل ہی کب ہے؟ لیکن یہ حکم ضرور دیگی کہ تم اپنے آداب خور و نوش کو ترک تشبہ کے ذریعہ ممتاز بناؤ کہ طریق خور و نوش ہر طرح تمھارا ہی اختیاری فعل ہے۔

وہ نہیں کہیگی کہ تم ترک تشبہ کے داعیہ سے لباس ہی ترک کردو کہ غیر مسلم لباس پہنتے ہیں کیونکہ تلبس و تن پوشی تو انسانیۃ کا ایک غیر اختیاری شعار ہے لیکن یہ ضرور کہیگی کہ تم لباس کی وضع و تراش کو غیر اقوام کے لباس سے ممتاز اور نمایاں رکھو کہ یہ ضرور تمھارے حدود اختیار میں ہے۔

شریعت کبھی نہیں کہیگی کہ تم غیر مسلمون کی ناک کان وغیرہ دیکھکر ترک تشبہ سے اپنے اعضاء

بدن کاٹ ڈالو کہ یہ اعضا تمہارے اختیار وایجاد سے کب موجود ہوئے۔ ہاں مگر یہ ضرور کہیگی کہ تمہارے چہرے اور بدن کا تجمل غیر اقوام کی زینتوں سے نمایاں ہو کہ یہ تو سر تا سر تمہارا ہی اختیاری فعل ہے۔ شریعت ہرگز حکم نہیں کریگی کہ غیر مسلمون کو عبادۃ کرتے ہوئے دیکھکر تم عبادۃ ترک کردو کہ جذبۂ عبادۃ محض فطری داعیہ ہے۔ لیکن یہ حکم ضرور کرے گی کہ اپنی مکمل طرق عبادۃ کو غیر اقوام کے ادھورے طرق سے ضرور ممتاز کر دو کہ یہ بلاشبہ تمہارا اختیاری فعل ہے۔

اسی طرح وہ خطاب نکرے گی کہ اگر غیر اقوام متمدن ہیں تو تم نفس تمدن ہی کا استیصال کردو کہ مدنی الطبع ہونا اور جانوروں کیطرح جنگلوں اور بھٹوں میں نہ گذار سکنا انسان کی ایک غیر اختیاری خواہش ہے۔ ہاں مگر وہ یہ خطاب لامحالہ کریگی کہ تم اپنے تمدن کے اصول اور اسکے روایتی دستور کو غیروں کے دساتیر سے ممتاز بنا دو کہ یہ تو بلاشبہ تمہارا ہی اختیاری عمل ہے۔

پس اب بعض سطح نظر انسانوں اور ان انسانوں کا (جو بیکاری سے دلچسپی رکھنے کے سبب عمل کے بجائے بھی گویا شبہات ہی اٹھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں)، یہ کہنا بالکل لچر اور حقیقت ناشناسی پر مبنی ہوگا کہ اگر تشبہ بالکفار حرام ہے تو ناک کان بھی کٹوا دو کہ کفار بھی ناک کان رکھتے ہین، سونا جاگنا وغیرہ بھی چھوڑ دو کہ وہ بھی سارے کام کرتے ہیں (گویا ترک تشبہ ایک ناممکن العمل مسئلہ ہے) اور تشبہ ومشابہتہ فطرۃ کا اقتضا، کیونکہ ممیت کے سلسلہ میں شریعت کو اختیاری اور تشریعی حیثیت سے امتیاز پیدا کرنا ہے نہ کہ تکوینی اور خلقی حیثیت سے اور انسانی افعال کو التباس سے بچانا ہے نہ کہ خدا کے افعال کو۔ نیز ایسے دانشمندوں سے الزامی طور پر کہا جائیگا کہ مسلم وکافر کی یہ اضطراری مشابہتہ اور صورت کی یکسانی سامنے رکھکر اختیاری امور میں تشبہ ومشارکتہ کا فتویٰ دیدینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی عقل کا دشمن جماع زوجہ کے حلال ہونے سے زنا کے جواز پر استدلال کرنے لگے کہ صورتاً وکیفاً زنا وجماع یکساں ہیں پس اگر یہ عقلمند جماع زوجہ کی مشابہتہ سے زنا کے حلال ہونے یا زنا کی مشابہتہ سے جماع زوجہ کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر کردیں گے تو ممکن ہے کہ اُن کے اس سوال پر بھی کوئی غور کیا جائے۔

طبعی اُمور | بہر حال مسئلہ تشبّہ کا تعلق اضطراری اور تکوینی اُمور سے کچھ نہیں وہ تو دیگر مسائل
شرعیہ کی طرح صرف اختیاری اُمور پر دائر ہے، لیکن اختیاری اُمور کی دو قسمیں ہیں طبعی اور قسری
طبعی افعال سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ اختیاری ہونے کی ساتھ ساتھ جبلّت و خلقت کے کسی اندرونی
داعیہ سے سرزد ہوں نہ کہ کسی بیرونی تعلیم اور سکھلانے یا بتلانے سے جیسے کھانا پینا وغیرہ کہ گو وہ
انسان کا اختیاری فعل ہے مگر اس کا منشا (بھوک پیاس) غیر اختیاری ہے اسلئے یہ باوجود
اختیاری ہونے کے بھی چونکہ طبعی ہے، اسلئے گویا اضطراری ہے۔ پس اسمیں بھی ہم ترکِ تشبّہ کے
مکلّف نہ ہوں گے۔

تعبّدی اُمور | قسری اُمور وہ ہیں جو کسی دلی جذبہ کے ماتحت ظاہر ہوں مگر اُن کا ظہور زیادہ تر
بیرونی آثار اور خارجی تعلیمات کا رہینِ منّت ہو۔ اُن کی پھر دو قسمیں ہیں۔ تعبّدی اور تعوّدی
یعنی وہ تعلیم کردہ اعمال یا عبادات اور دین کی قسم سے ہونگے یا عادات اور معاشرت وغیرہ
کی قسم سے صورتِ اولیٰ (مذہبی اُمور) میں تشبّہ بالغیر حرام ہے۔ جیساکہ نصاریٰ کی طرح
سینہ پر صلیب لٹکا لینا۔

ہنود کی طرح زنّار باندھ لینا یا پیشانی پر قشقہ لگا لینا۔ اور سکھوں کی طرح ہاتھ میں لوہے کا
کڑا پہن لینا۔ وغیرہ کیونکہ اس قسم ہی سے ملتوں کا امتیاز قائم ہو سکتا ہے۔ اور شرائع حقّہ [illegible]
باطلہ کے اختلاط و التباس کی تباہی سے بچ سکتی ہیں۔

تشبّہ بالذات اُمور | اور اگر تعوّدی یا معاشرتی اُمور ہوں تو پھر اُن کی دو صورتیں ہیں یا وہ
اُمور تشبّہ بالذات ہونگے یا مباح بالذات اگر تشبّہ بالذات ہیں [illegible]
مثلاً ٹخنوں سے نیچا پتلون۔ یا ملقّت بالفرنگ کوٹ یا کسی قوم کی [illegible]
معبودانِ باطلہ کی کوئی عظمت ظاہر کیجاتی ہو وغیرہ۔ کیونکہ تشبّہ بالغیر کے علاوہ ان میں حرمت کے
دوسرے اسباب بھی موجود ہیں کہ اسبال خیلاء، تکلیف، تعظیم اصنام وغیرہ تو بالذات ممنوعات
شرعیہ ہیں۔

شعار اقوام اور اگر وہ اُمور مباح بالذات ہیں تو پھر دو صورتیں ہیں یا وہ اُمور کسی غیر قوم کا شعار اور امتیازی نشان ہوں گے یا ایسا نہ ہوگا۔ اگر شعار ہیں تو پھر بھی تشبّہ قریب بہ حرام ہے جس کو فقہا نے اپنی اصطلاح میں مکروہ تحریمی سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً غیر اقوام کا وہ مخصوص لباس جو صرف انہی کی طرف منسوب اور انہی کی نسبت سے مشہور ہو اور اسکے استعمال سے استعمال کرنے والا اسی قوم کا فرد سمجھا جانے لگے۔ جیسے نصرانیوں کی ٹوپی یا کسی قوم کا کلامی شعار یا رجز وغیرہ جسکی تفصیل اپنے موقعہ پر آجائیگی۔

ذی بدل اشیاء اور اگر غیر شعار ہیں تو پھر دو صورتیں یا وہ غیر شعار اُمور ایسے ہوں گے کہ جن کا بدل مسلمانوں کے یہاں موجود ہوگا یا نہیں؟ اگر اُن کا بدل موجود ہے تو پھر اُن اُمور میں بھی تشبّہ مکروہ ہے۔ کیونکہ اسلامی غیرت و حمیت کا اقتضا یہی ہے۔ کہ ہم اقوام کی ان اشیا کو ترک کریں جنکا بدل ہمارے پاس موجود ہے۔ ورنہ یہ ایک بے عزّتی اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ اغیار کا دستنگر بنا دینا ہے۔ جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دست مبارک میں عربی کمان لیے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی تو ناخوشی سے فرمایا کہ یہ کیا لیے ہوئے ہو؟ اسے پھینکدو اور عربی کمان رکھو کہ جس کے ذریعہ خدا نے تمھیں قوّت و شوکت دی اور بلاد عجم کو مفتوح کیا۔ چونکہ فارسی کمان کا بدل عربی کمان موجود تھی اسلئے غیرت دلا کر حضور نے روکدیا تاکہ غیر اقوام کے ساتھ ہر ممکن سے ممکن امتیاز پیدا ہو جائے اور چھوٹے سے چھوٹا اشتراک منقطع ہو کر ایک مُسلم اپنی ہی ہستی کے ساتھ نمایاں ہو۔ ورنہ اگر مُسلم قوم اپنے گھر سے بے خبر ہو کر بلکہ اپنے گھر کو آگ لگا کر دوسروں کی عادات و معاشرت کا اتّباع کرنے لگیں تو ان کی مثال ایسی ہی ہو جائیگی کہ

ایک سبد پُرنان تُرا بر فرقِ سر	تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بہ زانوئے میان قعر آب	وز عطش وز جوع گشتی خراب

منفوی النشبہ اُمور ہاں اگر غیر اقوام کی اشیاء ایسی ہیں کہ اُن کا کوئی بدل مسلمانوں کے پاس نہیں جیسے آج یورپ کی نئی نئی ایجادات۔ جدید اسلحہ تمدن و معاشرت کے نئے نئے سامان

تو اسکی پھر دو صورتیں ہیں یا اُن کا استعمال تشبہ کی نیت سے کیا جائے یا بغیر نیتِ تشبہ پہلی صورت میں
استعمال جائز نہوگا۔ کیونکہ تشبہ بالکفار کو نیۃً وارادۃً مقصود بنا لینا انکی طرف میلان ورغبت بغیر
نہیں ہوسکتا اور کفار کیطرف میلان یقیناً اسلام کی چیز نہیں بلکہ اسلام سے نکال دینے والی چیز ہے۔
قرآن کریم نے تو صاف اعلان فرمادیا ہے۔ ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔

نیز غیر مسلموں کی کورانہ تقلید کسی مسلم کو کبھی بام عروج پر نہیں پہنچا سکتی جیسا کہ ظلمت کی تقلید نور
کی چمک میں مرض کی تقلید صحت میں اور کسی ضد کی تقلید دوسری ضد میں کوئی اضافہ وقوۃ نہیں پیدا
کرسکتی۔ ہاں اگر ان چیزوں میں تشبہ کی نیت نہو بلکہ اتفاقی طور پر استعمال میں آرہی ہوں تو ضرورۃ
کی حدتک انکے استعمال میں کوئی شرعی حرج نہیں۔

سدِ ذرائع اور احتیاط

ہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام تفاوت اور فرق مراتب علم واعتقاد
کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ عملاً ہر درجہ تشبہ کو ممنوع العمل قرار دے لینا ہی ایک مسلمان کے لئے احتیاط
اور حقیقی پرہیزگاری کا باعث ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ہر تمدن ومعاشرۃ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اور اس
سلسلہ کی ایک کڑی دوسری کو کھینچ لیتی ہے۔ پس کسی تمدن کی کسی چیز کو اختیار کر لینا گویا دوسری
چیز کے لئے راستہ صاف کر دینا ہے تو اس طرح انجام کار پورے ہی تمدن کا حلقہ اپنے گردن میں ڈال لینا
ہے۔ اسلئے بطور سد ذرائع تشبہ کی ان تمام مراتب سے خواہ وہ حرام ہوں یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی
عمل کے دائرہ میں یکساں ہی ممانعت کیجائے گی۔

کیونکہ شریعت کا یہ ایک جداگانہ اصول ہے کہ وہ اُن امور سے بھی ایک مکلف کو الگ رکھتی
ہے جو جواز وعدم جواز کے درمیان اشتباہ کا درجہ رکھتے ہوں کیونکہ وہ جسطرح حلال سے متصل ہیں
اسیطرح حرام سے بھی متصل ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ ہر ایک انسان بجائے حلال کے اُن کے
ذریعہ حرام میں مبتلا ہوجائے۔ چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں صاف لفظوں میں اعلان
فرمادیا گیا کہ۔

ومن وقع فی الشبہات کراع یرعیٰ حول الحمیٰ	جو شخص شبہات میں پڑ گیا وہ اس چرواہے کی مانند ہے

يوشك ان يواقعه الا وان لكل ملك حمى الا وان حمى الله محارمه	جو سلطانی چراگاہ کے قریب اورگرد وپیش ہی میں چرا رہا ہے قریب ہے کہ چراگاہ میں گھس جائیگا اور سلطانی عتاب کا

مورد ہو جائیگا، خبردار رہو ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے سنو! اللہ کی چراگاہ اُسکے محرمات ہیں۔ اور اُسکا قریبی گرد وپیش مشتبہات ہیں پس مشتبہات میں پڑجانیوالا ضرور ہے کہ محرمات کا ارتکاب کرنے لگے (الخ)

پس حدیث نے تنبیہ کی کہ تم جائزات اور حلال اُمور پر قناعت کرو۔

نہیں بلکہ بعض اوقات اُمت کے ارباب تقویٰ و تدین احتیاط اور پرہیزگاری کے دائرہ میں بعض ایسے جائز اُمور کو بھی ترک کردیتے ہیں جن کیلئے نہ کوئی صریح ممانعت ہوتی ہے نہ اُن کے کرلینے پر کوئی شرعی نکیر وملامت۔ لیکن اسوجہ سے کہ یا وہ اُمور ان کے فراست میں کسی نہ کسی شرعی کے بعید محتملات میں سے ہوتے ہیں یا بالکل جائز ہونے کے باوجود قوۃ قریبہ کے ساتھ کسی ناجائز حد تک پہونچا دینے کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں، جیسی حدیث میں فرمایا گیا۔

ما اسكر كثيره فقليله حرام	جس شربت کے کثیر حصہ میں نشہ ہو اسکا قلیل حصہ بھی حرام ہے

حالانکہ اس قلیل پر سکر اور نشہ نہیں لیکن یہ قلیل ہی اس کثیر تک پہونچانے کا ذریعہ بن جاتا اس لئے حرام ہوگیا۔

یا حدیث میں فرمایا گیا۔

من اتى عرافا فقد كفر بما انزل على محمد صلى الله عليه وسلم	جو شخص کاہنوں کے پاس گیا اُس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلائے ہوئے قانون کے ساتھ کفر کیا۔

حالانکہ کاہن اور ساحر کی بتائی ہوئی چیزوں کو ماننا اور اُن پر عملدرآمد کرنا تو کفر ہے لیکن محض اُسکے پاس چلا آنا اور اس کے نزدیک سے گذر جانا کفر نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ آنا اور گذرنا ہی اُسکی باتیں سننے اور پھر اُن کو ماننے اور پھر اُنپر عملدرآمد کرنے کا ذریعہ قریبہ تھا اسلئے اُس سے بھی کفر کہکر روک دیا گیا

اسی لئے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں۔

اياكم ومحقرات الذنوب	چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو۔

کیونکہ یہ حقیر گناہ ہی عظیم گناہوں کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔ اسی لئے جہاں قرآن کریم نے فرمایا:
لا یزنون = (مؤمن زناکار نہیں ہوتے) اور زنا سے ممانعت کی وہیں یہ بھی فرمایا کہ۔

لا تقربوا الزنا =	زنا کے قریب بھی مت ہو۔

یعنی دواعی زنا مثل لمس و تقبیل۔ یا شمّ رائحہ۔ یا قربت۔ یا خلوۃ سے بھی بچو کیونکہ یہی چیزیں زنا کے قریبی وسائل ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے حدود اللہ کی حفاظت کا حکم ان الفاظ میں دیا کہ۔

تلک حدود اللہ فلا تقربوھا۔	یہ اللہ کی حدود ہیں ان کے قریب بھی مت آؤ۔

یعنی گو قریب آنا فی نفسہٖ گناہ نہ تھا لیکن گناہ کا پیش خیمہ تھا اسلئے قربت بھی ممنوع ہوگئی۔
یہی وجہ ہے کہ جب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنیکی ممانعت فرمائی تو صدیق اکبر رضی اللہ نے اپنے کوڑا اٹھا دینے کا بھی کسی سے سوال نکیا جو گھوڑے سے گر پڑا تھا، بلکہ خود ہی اُتر کر اٹھایا۔ حالانکہ فی نفسہٖ یہ سوال جائز تھا۔ مگر اس کا ہنی سوال کے بعید محتملات لفظی میں سے ہونا بھی ممکن تھا، اسلئے احتیاطاً اس بعید امکان سے بھی رُک گئے۔
یہی وجہ ہے کہ جب حق تعالے نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی آواز کرنے کی ممانعت فرمائی اور کہا۔

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم بعضاً =	اے لوگو نبی کی آواز سے اپنی آوازوں کو اونچا مت کرو اور نہ اسطرح جہر سے مت بولو جسطرح تم ایک دوسرے سے بلند آواز سے بولتے ہو۔

تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جہوری الصوت، اتنا آہستہ بولنے لگے تھے کہ ان کی بات برابر سنائی نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ اتنی پست آوازی کا حکم نہ تھا لیکن تقوی کی احتیاط بہت سے جائز حصول کو بھی چھوڑا دیتی ہے جبکہ ان جائزات سے ممنوعات کا راستہ صاف ہوتا ہو پس جسطرح ان مختلف انواع۔ رغی حمی۔ مسئلہ مسکر۔ اتیان کاہن۔ قربت زنا۔ احتراز صغائر۔ اقتراب حدود۔ رفع اصوات اور مسئلہ سوال کی کتنی ہی مشتبہ یا جائز حدود محض اسلئے ترک

کی گئیں تاکہ ممنوع حدود تک کسی کی رسائی ہی نہو سکے۔ اسیطرح مسئلہ تشبّہ کے بارہ میں بھی شریعت کی نصوص اور عام قواعد شرعیہ اسیطرف راہنمائی کرتے ہیں کہ جس طرح اُسکے ممنوع حدود سے احتراز کیا جائے اسی طرح اُسکی مشتبہ یا بعض جائز حدود سے بھی پوری قوت کے ساتھ عملاً احتراز کیا جائے تاکہ حد حرام و ممنوع تک نہ پہونچ سکیں وانہا لکبیرة الا علی الخشعین۔

ان چند فصلوں میں ہم نے مذاہب و اقوام کے اصلی صورت پر نہ رہنے اور انجام کار اُنکے مٹ جانے کی اصولی اور کلی حقیقت کہ وہ تشبّہ بالاغیار ہے پھر تشبّہ کے تفصیلی مراتب کی فقہی کیفیت پیش کی۔ جسکو عقل و نقل اور محسوسات و طبیعیات سے باوجود کم مائگی اور بے بضاعتی کے ہم نے اپنی بساط کی قدر واضح کرنے میں کوشش کی۔ اور الحمد للہ کہ عقل سلیم اور نقل صحیح سے اس موضوع کو جسقدر واضح کرنے کی ضرورت تھی وہ بالاجمال واضح ہو چکا اور ثابت ہو گیا کہ اصولاً ترکیب شریعت کا تشبّہ سے بحث کرنا کسی خود بینی یا تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ غیرت و حمیت اور تحفظ خود اختیاری پر اور اسپر کہ کوئی قوم اسوقت تک قوم نہیں کہلائی جا سکتی جبتک کہ اس کی خصوصیات پائیدار اور مستقل نہوں۔ اور جبکہ اسلام کی امتیازی خصائص ہر حیثیت سے حق مستقل ناقابل تبدیل اور لازوال ہیں۔ تو سب سے زیادہ بلکہ صرف ایک اسلام ہی کو حق بھی ہے کہ وہ دنیا کی ساری قومیتوں کو مٹا کر اپنی برادری میں مدغم کرلے۔ اور اپنے ہی مخصوص رنگ سے ساری دنیا کو رنگ دے۔ یعنی قطع تشبّہ کے اصول کو سرملا استعمال کرکے غیر اقوام سے اپنی قوم کو بالکل ممتاز بنا دے۔ اگر اسلام اس مسلک تشبّہ بالاغیار (وہ تشبّہ جس سے قومیتوں پر فنا طاری ہوتی ہے جس سے ابتداءً الحاد و زندقہ اور انتہاءً کفر صریح وجود پذیر ہوتا ہے) کے انسداد کے طریقے تعلیم نہ کرتا اور اس کی ریشہ دوانیوں کو نہ روکتا تو یہ اسکے چہرۂ تمام و کمال پر ایک نہایت ہی بدنما دھبہ ہوتا۔

لیکن اسلام جسطرح ہر نقص کے دھبے سے پاک ہے اسیطرح اس عیب سے بھی پاک ہے۔ کہ اس میں مسئلہ تشبّہ پر کوئی شافی بحث نہو۔

اسلام نے اپنی مکمل تعلیم کے صفحات میں تشبّہ بالاقوام پر بھی کافی اور مکمل روشنی ڈالی ہے

اور انشاء اللہ ہم فروعی ابواب میں ..... ثابت کریں گے کہ اسلام کے تمام شعبوں (عادات، عبادات۔ حدود و کفارات۔ معاملات و سیاسیات، تدابیر تمدن طرق تہذیب، سُبل اخلاق، آداب معاشرت۔ اصول طعام و شراب، قوانین خواب بیداری، پھر تمام وہ کیفیات جو ایک انسان پر خلوۃ و جلوۃ۔ انفراد و اجتماع۔ نفسی و آفاقی۔ مادی و روحانی طور پر آسکتی ہیں) اسکے ہر ہر پہلو میں ترک تشبہ کی تعلیم موجود ہے۔ گویا اسلام کا مجموعی مرقعہ ہی ترک تشبہ کا ایک درس عبرت آموز ہے۔ مگر انہی توفیق شعار انسانوں کیلئے جو علم ازل میں اس عبرت سے مستفید ہونے کیلئے چھانٹ لئے گئے تھے۔ مسئلہ تشبہ کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب ہم آئندہ باب کی چند فصلوں میں اُن شبہات کا ازالہ کرینگے جو اس مسئلہ پر اب تک کئے گئے ہیں +
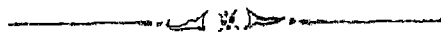
باب دوم

بحث وتنقید

حدیث من تشبہ بقوم فہو منہم

یہاں تک الحمد للہ مسئلہ کا ہر پہلو تحقیق کی روشنی میں آچکا ہے۔ اور مسئلہ تشبہ کی حقیقت۔ اسکی ضرورت اور شریعت کا اس کے بارہ میں انتہائی اہتمام کرنا سامنے لایا جا چکا ہے۔ ہاں ابھی تک یہ ضرورت باقی ہے کہ ہم اُن نکتہ چینیوں اور شبہات و وساوس کی بھی مدافعت کریں جو سطحی النظر لوگوں کیطرف سے اس مسئلہ کو مخدوش بنانے کیلئے کئے گئے اور تا حال کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ پھر مسئلہ تشبہ بالکل بےغبار ہو جائے اور ایک جویائے عمل کیلئے شاہراہ عمل نمایاں ہو سکے۔

ان شبہات وخدشات کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ بعض کا اثر مسئلہ کے اعتقاد پر پڑتا ہے اور بعض کا عمل پر۔ یعنی بعض شبہات کا حاصل سرے سے مسئلہ ہی کی تکذیب وتغلیط ہے اور بعض کا محصول عمل کی تعطیل۔ پھر اعتقادی خدشات میں بھی دو پہلو اختیار کئے گئے ہیں۔ بعض نے اس شرعی مسئلہ کی تکذیب میں خود شریعت ہی کو آلۂ کار بنایا ہے اور گویا تردید مسئلہ کی منزل پر وہ لوگ تاویل کی راہ سے پہنچے ہیں تاکہ اُن کو مکذب دین نہ کہا جا سکے۔ اور بعض عاقبت ناشناسوں نے اس منصوص مسئلہ کی تکذیب میں اسکی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ صرف اپنے اہواء وتخیلات ہی کو تردید کی کافی وجوہ خیال کر کے شریعت کے بالمقابل خم ٹھوک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہم بحول اللہ وقوتہ ہر فریق کے استدلال پر بالترتیب پہلے بحث وتنقید کی نظر ڈالینگے اور پھر تحقیق کی۔ یعنی مناظرانہ اور الزامانہ جواب کے بعد اسکی حقیقت نمایاں کرینگے کہ اصل حقیقت کیا تھی؟ جس کو حقیقت ناشناسوں نے اپنی کج فہمی سے اس حد تک پہونچایا کہ وہ حقیقت کے بجائے ایک مغسطہ اور دھوکہ نظر آنے لگی۔

وباللہ التوفیق۔

فصل

پہلی قسم کے لوگوں نے (جو مجتہدانہ یا مُوّلانہ رنگ سے میدان خلاف میں آئے) قومی لکچروں۔ سیاسی خطبوں اور مطبوع تحریروں میں بہت ہی بلند بانگ ہوکر دعویٰ کیا کہ مسئلہ منع تشبّہ ایک ناممکن العمل اور غیر معقول مسئلہ ہے۔

اور مسئلہ تشبّہ کی صریحی بنا حدیث من تشبّہ بقوم فھو منھم پر تھی اسلئے اس حدیث کے ردّ و تضعیف میں اُنہوں نے اپنا سارا دماغی زور صرف کیا ہے۔

سر سیّد بانی کالج علیگڈھ جنکا اہم مقصد مسلمانوں کے دل و دماغ سے ان کے قدیم مخصوص اوضاع و شعائر کی اہمیت کا نکالنا تھا۔ اس طبقہ کے پیش رو ہیں۔ اُنہوں نے اس حدیث کو اپنے مقصد میں حائل دیکھکر اُسکو گرانے اور ساقط الاعتبار بنانے میں اپنے ایک موقت رسالے تہذیب الاخلاق کے کتنے ہی صفحات رنگے ہیں۔ اور اپنے زور قوۃ کے موافق مسئلہ منع تشبّہ کا استیصال کردیا ہے۔ اُنہوں نے حدیث مذکور پر چھ شبہات وارد کئے ہیں۔ پہلا شبہہ روایت اور سند کے اعتبار سے ہے۔ اور پانچ شبہے درروایت اور تفقہ کے لحاظ سے ہیں۔ روایتی شبہات (یعنی ضعف رُواۃ یا انقطاع) کے متعلق وہ تہذیب الاخلاق جلد چہارم بابت ۱۲۹۱ھ کے صفحہ ۲۰۴ پر لکھتے ہیں کہ۔

"اول تو مجھکو یہ بیان کرنا چاہیئے کہ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ نہ روایۃً اور نہ درایۃً روایۃً تو اسلئے ثابت نہیں کہ جو سند اس حدیث کی بیان ہوئی ہے اُس سے اتصال سند کا رسول خدا تک ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ جو الفاظ روایت کے ہیں اُن سے یہ بات لازم نہیں ہے کہ حسان اور ابی منیب کے درمیان میں اور کوئی راوی نہو پس جبکہ سلسلۂ رُواۃ غیر ثابت ہے تو وہ حدیث فی نفسہٖ ثابت نہیں۔"

اس مجہول شبہہ کے متعلق ہمیں کسی جوابی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا بہترین حل

اتفاق سے محدث شہیر حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں کر دیا ہے۔ اولاً حدیث مع سند حسب ذیل ہے۔

حدثنا عثمان بن ابی شیبۃ قال حدثنا ابو النضر یعنی ھاشم بن القاسم قال حدثنا عبد الرحمٰن بن ثابت قال حدثنا حسان بن عطیۃ عن ابی منیب الجرشی عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم (رواہ ابوداؤد باب ماجاء فی الاقبیہ)

پہلے راوی عثمان بن ابی شیبہ ہیں۔ دوسرے ابو النضر تیسرے ہاشم بن القاسم۔ چوتھے عبد الرحمٰن بن ثابت۔ پانچویں حسان بن عطیہ۔ چھٹے ابو منیب جرشی ہیں جنہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا کہ انہوں نے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے کسی قوم کیساتھ مشابہت اختیار کی وہ اسی قوم میں سے ہوگیا۔

حافظ ابن تیمیہ نے اسکے پانچوں رجال کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

ابن ابی شیبہ۔ ابو النضر۔ حسان بن عطیہ۔ صحیحین کے ان مشاہیر اور اجلہ رواۃ میں سے ہیں کہ اُن کی ثقۃ و عدالت ہرگز اس قول کی محتاج نہیں کہ وہ "صحیحین کے رجال میں سے ہیں" بلکہ صحیحین کے رجال کی جماعت اسلئے ایک سنہری لڑی ہے کہ ان جیسے ثقہ حضرات اس زنجیر کی کڑیاں ہیں۔

عبد الرحمٰن بن ثابت اُن رواۃ میں سے ہیں کہ یحییٰ بن معین ابو زرعہ اور احمد بن عبد اللہ جیسے ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ لیس بہ بأس (اسکے بارہ میں کوئی جرح و خلجان نہیں ہے) اور عبد الرحمٰن بن ابراہیم نے فرمایا کہ ھو ثقۃ ابو حاتم جیسے امام نے فرمایا کہ ھو مستقیم الحدیث۔

ابو منیب جرشی بھی ان صدوق رواۃ میں سے ہیں جنکے متعلق احمد بن عبد اللہ العجلی فرماتے ہیں کہ ھو ثقۃ (وہ ثقہ ہیں) میں نہیں جانتا کہ کسی نے بُرائی سے اُن کا ذکر کیا ہو۔ اس بیان سے سیّد موصوف کی تضعیف رواۃ جو ہنوز پردہ خفا میں ہے ہبائً منثوراً ہوجاتی ہے۔

سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ کیونکہ جو الفاظ روایت کیے ہیں اُن سے یہ بات لازم نہیں ہے

کہ حسان اور ابی منیب کے درمیان میں اور کوئی راوی نہو" لیکن اول تو بسلسلہ سند پر الفاظ حدیث سے جرح کرنا ہی جرح و تعدیل کا ایک انوکھا اصول ہے۔ اور پھر وہ دعویٰ انقطاع مذکور بھی تو نہیں کہ کیوں یہ بات لازم نہیں آتی"۔

پس یہ بات مدلل تو کیا ہوتی کہ حسان اور ابی منیب کے درمیان میں انقطاع ہے اور سماع ثابت نہیں اور الٹی مجہول بھی رہگئی اسلئے جواب دہی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن تبرعاً اس انقطاع کا جواب یہ ہے جو ابن تیمیہ نے دیا ہے کہ۔

وقد سمع منہ حسان بن عطیۃ وقد احتج الامام احمد وغیرہ بھذا الحدیث ۔

حسان بن عطیہ کا ابی منیب سے سماع ثابت ہے اور امام احمد وغیرہ نے اس حدیث کو حجۃ سمجھا اور اس سے احتجاج کیا ہے۔ (اقتضاء الصراط المستقیم صفحہ ۳۹) ۔

پس ابن تیمیہ کے اثبات سماع کے مقابلہ میں سید صاحب کی نفی سماع کیا وقعت رکھ سکتی ہے اور امام احمد کے احتجاج کے مقابلہ میں ان کا حدیث کو حجۃ نہ ماننا ہمارے نزدیک کیا اہمیت رکھتا ہے۔

پھر نہ صرف اسی ایک سند اور ایک کتاب پر اس حدیث کا مدار ہے۔ بلکہ طبرانی نے اپنے معجم کبیر اور اوسط میں عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اور بزار نے اپنے مسند میں حذیفہ وابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے پھر ابو نعیم نے تاریخ اصبہان میں انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور قضاعی نے طاؤس سے مرسلاً بھی روایت کیا ہے (شرح جامع صغیر) اور ابن قیم کہتے ہیں کہ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ زاد المعاد صفحہ ۳۶ جلد ۱۔

پس اگر کسی ایک سند میں ضعف بھی تسلیم کر لیا جائے تو کثرۃ طرق کی قوۃ حسب اصول حدیث اس ضعف کا کافی تدارک ہے۔ اسلئے کسی کا منہ نہیں ہے کہ محض خلاف اغراض ہونے کی وجہ سے اس حدیث کی تضعیف کے درپے ہو۔ اور کسی کلام نبوۃ کو اپنی رائے پر قربان کرے معاذ اللہ منہ۔

فصل

درایتی شبہات

(پہلا شبہہ)

سرسید۔ تہذیب الاخلاق جلد چہارم کے صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں کہ: "راوی نے مورد حدیث بیان نہیں کیا اور لفظ اشیہ کا جو حدیث میں واقع ہے مورد حدیث کے نہ معلوم ہونے سے کسی حکم مدلولی یا استنباطی یا قیاسی کا فائدہ نہیں دیتا ہے"

اول تو یہی غلط ہے کہ حدیث کا مورد متعین نہیں ہے۔ جبکہ تمام صحابہ مختلف مواقع دینی دنیا میں اس حدیث سے احتجاج کر رہے ہیں (جیسا کہ ہم پہلے باب میں اس حدیث کے ماتحت پیش کر چکے ہیں اور آئندہ دوسرے حصص میں جزئیات کا ذخیرہ انشا اللہ پیش کرینگے)۔ تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مورد متعین نہیں۔ جن جن مواقع میں اسکو استعمال کیا گیا، کم از کم وہ مواقع تو مورد بننے کی صلاحیت ضرور ہی رکھتے ہیں۔ لیکن اگر بالفرض مورد متعین نہیں بھی ہے تو نہو۔ کہ حدیث کے کلمات تالیفیہ خود بامعنی اور موضوع ہیں نہ کہ مہمل اور بے معنی۔

پس عام قواعد شریعت کے دائرہ میں رہکر اسکے لغوی مدلول سے ہی حدیث کی مراد متعین کیجا سکتی ہے بلکہ اصول فقہ کے قواعد نے تو یہاں تک واضح کر دیا ہے کہ اگر مورد متعین بھی ہو تب بھی اس کا اعتبار نہیں، اعتبار صرف عموم کلمات کا کیا جاتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا۔ العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص المورد۔ اس لئے یہ سوال ہی مہمل اور بے معنی ہے۔

دوسرا شبہہ

پھر سید صاحب تہذیب الاخلاق کے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ۔ "دوسرے یہ کہ لفظ قوم جو امت

حدیث میں ہے وہ بھی کسی نتیجہ کا فائدہ نہیں دیتا۔ کسی قوم کا ہونا یا کسی قوم کے مشابہہ بننا کسی نتیجہ شرعی کو مفید نہیں ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان نے عربی یا ایرانی یا پٹھانی یا روسی یا انگریزی پوشاک پہنکر اپنے تئیں مشابہہ اُن قوموں کے بنایا اور لوگوں نے بھی اُسکو اُسی قوم کا سمجھا تو پھر اُس سے نتیجہ شرعی کیا نکلا؟"

(جواب)

نتیجہ شرعی ایک نہیں بلکہ متعدد نکلتے ہیں۔

| امحاء امتیاز | ایک مہلک نتیجہ یہ نکلا کہ اقوام کفر و اسلام میں کوئی ظاہری امتیاز نہ رہا۔ حالانکہ شریعت

کا مقصود اقوام میں باہمی امتیاز پیدا کرنا ہے۔ جبتک کہ وہ اقوام ہیں نہ کہ تلبیس والتباس چنانچہ آیات و احادیث اور فرامین خلفاء راشدین وغیرہ سے اس مقصود پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ تشبہ کے بعد شریعت کا یہ معقول مقصد (امتیاز اقوام) فوت ہو جاتا ہے۔

| تقویۃ حجۃ کفار | امتیاز مٹ کر جبکہ صورتًا التباس و اشتراک پیدا ہوگا۔ تو اس ظاہری اشتراک

عمل ہی سے کفار کو مسلمانوں پر ایک حجۃ ہاتھ آجائیگی، جس کو بطور نظیر قائم کرکے وہ اور دوسرے اُمور میں بھی ایسے ہی اختلاط و التباس کی طمع رکھہ سکیں گے۔ حالانکہ ان کی ظاہری حجۃ تک کو بھی قطع کر دینا اسلام کا ایک اہم مقصد ہے۔ جیسا کہ نسخ قبلہ سے اسی ظاہری مشارکۃ عبادۃ یا صوری یک رُخی و یک جہتی کو مٹایا گیا لئلا یکون للناس علیکم حجۃ۔

| استخفاف ادضاع شریعت | شریعت اسلام نے اصولی طور پر لباس کی سادگی و بذاذۃ کے متعلق جو

حدود قائم کی ہیں اور اُن سے جن روحانی منافع کو ملحوظ رکھا گیا ہے (جیسا کہ ہم لباس کی فصل میں بالتفصیل ظاہر کریں گے) تشبہ بالغیر سے اُن کا استخفاف و استہزاء لازم آتا ہے۔

جو یقینًا توہین شریعت ہے۔ اور ایک متشبہہ کا عملًا اور بعد چندے اعتقادًا بھی استہزاء اور استخفاف خاص شعار ہے۔ چنانچہ انگریزی معاشرۃ کے دلدادہ یا متشبہین افرنجیت کسی اسلامی ثقاہت و سادگی کو خواہ وہ لباسی ہو یا عام معاشرتی کبھی وقعت و احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ تحقیر کی آنکھ سے معائنہ کرتے ہیں۔ اور حالت اسلام میں داعیہ توہین اسلام یقینًا نفاق کا

تشبہ ہے۔

میلان بہ اغیار پھر کسی غیر سے مشابہت پیدا کرنے کا داعیہ بغیر اسکی طرف میلان و رغبت کے پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور یہ میلان خود ہی ایک ممنوع شرعی ہے ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔ پس جس چیز کے مقدمات ممنوع شرعی ہوں کیا اُس کے اصل نتیجہ کو شریعت کے جائزات میں سے کہا جا سکتا ہے؟۔

الغاء تعامل سلف نیز سلف صالحین کا ہر قرن میں منع تشبہ پر زور دینا اور لباس کو خصوصیت کے ساتھ تشبہ سے بچانے کی کوشش کرنا سب لغو ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا دفار (باندی کے) بدن سے حرائر کا لباس اُتروا دینا اور ڈانٹ کر کہنا اتتشبہین بالحرائر؟ پھر عمر ثانی حضرت عمر بن عبد العزیز کا، نصاریٰ بنی تغلب کے وفد سے عربی لباس اُتروا دینا اور اُسکو قطع کر کے مسلمانوں کے لباس سے ممتاز کر دینا۔ امام ابو یوسف کا اپنے زمانہ قضاء و حکمرانی میں علماء و فقہاء کیلئے ایک ممتاز لباس تجویز کرنا تاکہ فقیہ و غیر فقیہ نمایاں رہیں۔ محدث شہیر امام ابو داؤد سجستانی کے ایک استاد کا امیر وقت کو باریک کپڑے پہنے ہوئے دیکھ کر کہہ اُٹھنا کہ امیرنا یلبس ثیاب الفساق اور پھر قرون مابعد میں عموماً فقہاء، اُمت کا ایسی جزئیات پر تشدد کے ساتھ روک ٹوک کرنا سب ہی لغو اور باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ تعامل سلف خود ایک مستقل دلیل کا درجہ رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ مالک امام دار الہجرۃ تعارض احادیث کے وقت محض تعامل اہل مدینہ ہی کو زبردست مرجح قرار دیتے ہیں۔

شہادۃ سیئہ ایک مسلمان کو کافرانہ صورت میں دیکھ کر عام گمان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اسلامی فرد نہیں۔ یا اگر ہے تو اسکے دل میں عام اوضاع مسلمین کی کوئی عظمت نہیں جو نفاق کی دلیل ہے پس مسلمانوں کا کسی کے حق میں کافر یا منافق ہونے کا گمان رکھنا یا اُسکے غیر مسلم اور منافق ہونے کی شہادت دینا کیا عند اللہ کوئی اثر نہیں رکھتا۔ حالانکہ انتم شہداء اللہ فی الارض۔

اجراء احکام کفر پھر قطع نظر خصوصی معلومات کے عموماً جبکہ ایسے متشبہ کو غیر مسلم جماعت کا فرد تصور کیا جائے گا تو کیا یہ ممکن ہے کہ اسکی موت کے وقت جبکہ وہ کسی اجنبی جگہ فوت ہو احکام

دنیا میں کوئی اسلامی ضابطہ اسپر جاری کیا جائے؟ اسکے جنازہ کی نماز پڑھی جائے۔ یا مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن کیا جائے۔ یا عام تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ پر عمل میں آئے؟ ہرگز نہیں اور یہ ایک عظیم الشان محرومی ہے۔

پس اگر بقول سید صاحب کے تشبّہ کو صرف لباس ہی میں منحصر مان لیا جائے تو کیا ان لباسی تشبّہ سے کوئی شرعی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا؟ کیا امتیاز اقوام کا مٹ جانا، کفار کے ہاتھ میں مسلمانوں کے خلاف کسی حُجّت کا ہاتھ آجانا۔ عام اوضاع مسلمین کا استخفاف و استہزا قلوب میں جاگزیں ہو جانا۔ اسلامی قلوب میں کفار کیطرف رکون و میلان کا پیدا ہو جانا۔ تعامل سلف کا باطل ٹھیرایا جانا۔ مسلمانوں کا کسی کے حق میں بُری شہادۃ دینا۔ احکام دنیا میں کسی پر اسلامی احکام کا جاری نکیا جانا۔ کیا یہ سب شرعی اُمور نہیں ہیں جنکے متعلق خود شریعت نے اپنی نصوص میں اثباتاً و نفیاً بحث کی ہے۔

اور جبکہ تشبّہ بالکفار اپنے ساتھہ یہ تمام ممنوعات لیکر آتا ہے تو کیا تشبّہ بالاقوام سے کوئی بھی شرعی نتیجہ نہ نکلا؟ حالانکہ یہ تمام شرعی نتائج ہیں جو اس سے پیدا ہوئے اور اس لیے جیسے تشبّہ بنفسہٖ ممنوع ثابت ہوا تہا، اب اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی ممنوع بن گیا۔

تیسرا شبہہ

سید صاحب تہذیب الاخلاق کے صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں جس کا ماحصل ملاحظہ ہو۔ "جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جُبہ رومیہ ضیقۃ الکمین جو عیسائیوں کا لباس تہا پہنا، نیز حضور نے جبہ شامیہ جو یہود کا لباس تہا پہنا۔ نیز حضور نے جبہ طیالسیہ جو آتش پرستوں اور مجوس کا لباس تہا پہنا۔ اگر تشبّہ ممنوع تہا تو حضور نے کیوں ایسے اُمور کا ارتکاب فرمایا نیز صحیح بخاری میں ہے۔

کتاب اللباس باب قول اللہ قل من

(کتاب اللباس) باب بیان میں قول اللہ تعالیٰ کے کہ فرمادیجئے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑونکو جنکو اُس نے

حرّم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبٰت من الرزق وقال النبي صلى الله عليه وسلم كلوا واشربوا والبسوا ما طاب لكم الخ	اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہی اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہی؟ اور فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کھاؤ پیو پہنو (جیسی جو تمھیں بھائے)؛

پس یہ آیۃ وحدیث تشبہ کے مسئلہ کو باطل ٹھیرا رہی ہے۔ (جواب) میں کہتا ہوں کہ۔
تشبہ کے کلی اور اصولی مسئلہ کے خلاف بہت تجسس و تلاش کے بعد یہ تین جبوں کی جزئیات پیش کی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر بالفرض چند جزئیات کلیہ کے معارض بھی ہوں تو کیا ان چند جزئی واقعات کی خاطر کلیہ کو باطل کر دینا چاہیے یا کلیہ کو اصل رکھکر ان مستثنیات کا کوئی ایسا محل بیان کر دینا چاہیے کہ کلیہ پر بھی زد نہ پڑے اور متعارض جزئیات بھی برمحل باقی رہجائیں ہمارے نزدیک عقلاً اور شرعاً دوسری صورت ہی قابل عمل ہو سکتی ہے کیونکہ کلیہ اور ضابطہ اصولی اسباب اور کلی علل وحکم پر مبنی ہوتا ہی اور جزئی واقعات اس قسم کے کلی علل و اسرار سے ساکت ہوتے ہیں پس ناطق کو اصل رکھکر ساکت کو اس کا تابع بنانا ہی اصولی اور عقلی فعل قرار پا سکتا ہی۔ پس ان تینوں جزئیات کو اصول حدیث کے مطابق بے تکلف کہا جا سکتا ہی۔ کہ واقعۂ حال لاعموم لہا۔ یعنی ان وقائع میں کوئی ایسی عام علۃ یا سبب یا وجہ نہیں کہ کلیہ تشبہ کے توڑنے میں اس سے مدد لیجا سکے۔ نیز ہمیں ابتک ان جزئیات میں کوئی لفظ بھی ایسا محسوس نہیں ہوا جو ان ہر سہ جبوں کے استعمال سے تشبہ کے جواز کا نتیجہ پیدا کرتا ہو کیونکہ تشبہ مشابہت سے ماخوذ ہے اور شبہہ کے معنی ہیں دو چیزوں کا آپسمیں ایسا ملتبس ہو جانا کہ کوئی بھی اپنے اصلی وجود کو نمایاں نہ رکھہ سکے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا شبہہ ایک انسان کو دوسرے کیسا تھہ اسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ پہلا دوسرے کے مخصوصات اور امتیازی نشانات کو اختیار کرے۔ اور صدر اس میں رل ملجائے اور یہاں اسکی کوئی دلیل نہیں کہ جبہ رومیہ عیسائیوں کا اور جبہ شامیہ یہود کا اور جبہ طیالسیہ مجوسیوں کا کوئی مخصوص لباس تھا تا آنکہ تشبہ اور تشبہ پر کوئی استدلال کیا جا سکے؟ بلکہ محض رومی، شامی اور طیالسی کی نسبت سے تو یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ جبے

اُن کے استعمال میں بھی آتے ہوں چہ جائیکہ اُن کا مخصوص شعار ہوں۔

کیونکہ مصنوعات کی نسبتیں کبھی تو موجد اور صانع کی طرف کیجاتی ہیں اور اسی نسبت سے وہ شئے موسوم اور مشہور ہو جاتی ہے جیسے ڈاسن کا بوٹ اور پیرس سوپ (پیر کا صابون) پس اگر کہا جائے کہ ہندوستانی پیرس سوپ اور ڈاسنس بوٹ استعمال کرتے ہیں تو محض اس نسبت سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ ہندوستانی ڈاسن اور پیر سے تشبّہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اس نسبت سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ڈاسن اور پیر خود اس بوٹ اور صابون کو استعمال بھی کرتے ہوں چہ جائیکہ یہ اُن کا کوئی امتیازی نشان ہو۔ ہاں صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بوٹ اور صابون اُنکی دوکان کا یا اُن کا مصنوع ہے جسے ہندوستانی استعمال کرنے لگے ہیں۔

اسی طرح کبھی مصنوعات کی نسبتیں جائے صنعت اور خاص خاص شہروں یا ملکوں کیطرف ہوتی ہیں اور وہ اسی نسبت سے دنیا میں مشہور ہو جاتی ہیں۔ جیسے کپڑوں میں اٹالین یا بنارسی کہ اٹالین اٹلی کی ساخت ہونے کی وجہ سے اسی ملک کیطرف منسوب ہے۔ اور بنارسی بنارس کیطرف منسوب ہے کہ وہیں کی صنعت ہو۔

پس اگر کہا جائے کہ فلاں شخص بنارسی اور اٹالین استعمال کرتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ کپڑے اٹالیوں اور بنارسیوں کے مخصوص شعائر ہیں اور وہ شخص یہ کپڑے استعمال کر کے اُن لوگوں کے ساتھ تشبّہ کر رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ شعار اور تشبّہ کیا معنی ان نسبتوں سے تو یہ سمجھا جانا بھی ضروری نہیں کہ یہ مصنوعات وہاں سرے سے استعمال بھی کیجاتی ہوں بلکہ ممکن ہے کہ تجارت کے سلسلہ میں محض دوسرے ممالک کیلئے بنائی جاتی ہوں۔ جیسے اکثر رنگین اور شوخ کپڑے یورپ میں بنا کر ایشیا میں بھیجے جاتے ہیں اور یورپین ان سے قطعاً اجتناب کرتے ہیں پس کپڑوں کی یہ نسبتیں محض صناعوں یا جائے صنعت کے اعتبار سے مشہور ہوتی ہیں جنکو تشبّہ سے کوئی علاقہ نہیں۔

اسیطرح جبکہ روایات میں آیا کہ حضور نے رومی۔ شامی اور طیالسی جبہ استعمال فرمایا تو محض

اس نسبت سے یہ کیسے مفہوم ہو گیا کہ وہ جبے ان ممالک کے باشندوں کے مخصوص شعار اور خاص لباس تھے اور حضورؐ نے انہیں پہنکر تشبہ کا بیان جواز فرما دیا۔ شعار تو کیا یہ نسبتیں تو نفس استعمال پر بھی دلالت نہیں رکھتیں۔ پس ان نسبتوں سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ یہ جبے ان ممالک کے تھے وہاں کے مصنوع تھے یا وہاں بکتے تھے اور وہیں سے دوسرے ممالک میں منتشر ہوتے تھے۔ اور حضورؐ نے بھی ایک غیر ملکی صنعت کا اتفاقاً استعمال فرما لیا۔

یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برد یمانی استعمال فرماتے تھے تو کیا اس نسبت سے یہ بھی لازم آنا ضروری ہے کہ یہی چادر وہاں کے لوگوں کا خاص شعار ہے اور آپ یمنیوں کے ساتھ تشبہ بھی سمجھے جائیں؟ ہرگز نہیں۔ یا حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شام و مصر کی آئی ہوئی قباطی استعمال فرماتے تھے (قباطی اس کتانی چادر کو کہتے ہیں جسکو قبطی بنتے تھے یہ نسبت بنانے والوں کی طرف ہے) تو کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ حضور قبطیوں کے ساتھ تشبہ کرتے تھے؟ معاذ اللہ۔

حالانکہ محض اس نسبت سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ قبطی اس چادر کو سرے سے استعمال بھی کرتے ہوں چہ جائیکہ یہ چادر ان کا مخصوص شعار بنکر تشبہ کا دروازہ کھولتی ہو؟ پس ایسی مبہم نسبتوں سے منع تشبہ کے مبیّن اور واضح اصول کو توڑنا یا جواز تشبہ پر استدلال کرنا ایک نہایت ہی بے معنی استدلال ایک بے دلیل دعویٰ بلکہ ایک خلاف دلیل مدعیٰ ہوگا جس کی توقع کم از کم کسی اہل علم سے نہیں کیجا سکتی۔

بہر حال کسی کلیہ حدیث۔۔۔ اور قولی دستور العمل کے مقابلہ میں اگر اس قسم کی عملی جزئیات ظاہر نظر میں معارض بنکر سامنے آجائیں درانحالیکہ ان جزوی واقعات کی کوئی واضح علت نظر آتی ہو نہ بین سبب تو ان جزئی امور کے سبب اس کلیہ میں کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے واضح اسباب بھی موجود ہیں اور بیّن علل بھی۔

بلکہ کسی کلیہ اور ضابطہ کے مقابلہ میں کسی جزئی کا اسکے معارض ثابت ہو جانا ہی اس جزئی

بھی تاویل کرنے کیلئے کافی ہے اگرچہ لغۃً رفع تعارض کی کوئی وجہ بھی نمایاں نہ ہو۔ صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دن حضورؐ نے زعفران سے رنگے ہوئے سرخ کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔

ان ھذا من لباس الکفار لا تلبسھما۔	یہ سرخ کپڑے کفار کے کپڑے ہیں۔ انہیں مت پہنو۔

اور نہ صرف زعفرانی سرخی ہی بلکہ عموماً سرخ کپڑوں سے ممانعت احادیث کے صریح الفاظ میں فرمائی گئی ہے اور ادھر صحیح حدیث میں اس کلی اور قولی ضابطہ کے خلاف یہ عملی جزئیہ بھی موجود ہے۔ کہ

وعلیہ حلۃ حمراء	حضورؐ پر سرخ ازار و چادر دیکھی گئی!

پس ابن قیم رحمہ اللہ صاحب زاد المعاد نے بھی کہا ہے کہ جبکہ ممانعت حمرۃ کے صریح اقوال موجود ہیں تو کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے دوسروں کو ممانعت فرما کر خود وہی احمرقانی استعمال فرمایا ہو؟ ہرگز نہیں۔ پس کہا جائیگا کہ اس سرخ حلۃ سے سرخ دھاری کا حلہ مراد ہے کیونکہ یہ حلۃ حمراء یمنی چادروں کا تھا۔ اور یمنی چادروں کی عام روش یہی تھی کہ وہ سرخ اور سیاہ دھاری کی بنی جاتی تھیں۔ مگر لوگوں کو حلۃ حمراء کے لفظ سے خالص سرخ ہونے کا دھوکہ لگ گیا۔

بہرحال یہ جزئیات اس درجہ کی نہیں ہیں کہ سید صاحب کو ان کے اس مقصد استیصال مسئلہ تشبہ میں کامیاب بنا سکیں۔ رہا آیۃ کریمہ قل من حرم زینۃ اللہ اور حدیث نبوی کلوا واشربوا والبسوا کے عموم سے جواز تشبہ پر استدلال کرنا اور اس پر بخاری کی اس تفسیر ابن عباس کا مطلب لکھ (جو تمھیں بھائے اور پسند ہو) جواز کی تعمیم سے تشبہ میں دلیل نا پہلے استدلال سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

کیا اس عموم کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ کھانے پینے میں تمھارے لئے شراب و خنزیر بھی حلال ہے۔ اور پہننے میں ریشم بھی جائز ہے؟ اگر یہ عموم اسلئے نہیں لیا جا سکتا کہ دوسرے

بمواقع پران چیزونکو ممنوع قرار دیا گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ زینت کے تمام اُن شعبوں کو جو تشبہ پر مشتمل ہیں دوسری دلائل ممنوع قرار دیرہی ہیں ۔ وہ بھی اس آیت کے عموم مین داخل ہو کر حلال نہیں بن سکتیں کوئی وجہ نہیں کہ باب اکل و شرب میں تو دوسری دلائل خنزیر و شراب لحوم سباع آسار غیر ماکول اللحم اور دوسری بہت سی انواع ماکولات کو ناجائز اور ممنوع ثابت کر سکیں لیکن باب لباس میں اسی قسم کی دوسری دلائل ریشم ۔ معفرق زری ۔ اوضاع کفار اور اطوار غیر مسلمین کو ناجائز نہ بنا سکیں؟

حقیقت یہ ہے کہ نکتہ چینوں نے خود اس حدیث ہی کے الفاظ پر غور نہیں کیا اور نہ اس کے مدلول لغوی و شرعی کو سمجھے ۔ حدیث میں جہاں یہ الفاظ ہیں کلوا واشربوا والبسوا وتصدقوا وہیں آگے یہ لفظ بھی تو ہیں کہ فی غیر اسراف ولا مخیلۃ ۔ یعنی کھاؤ پیو پہنو اور خرچ کرو جبتک کہ اس میں اسراف اور مخیلہ کا دخل نہ آئے ۔ اس شرط کا حاصل یہ نکلا کہ جب کھانا پہننا فضول خرچی اور خیلاء و تکبر و ناز و ترفہ اور اترا ہٹ کی حدود پر پہونچ جائے تو اس حد کے کھانے پہننے سے رُک جاؤ ۔ پس تمام وہ کپڑے جنمیں اسراف و خیلاء ہو ۔ تمام وہ اوضاع و اطوار جنمیں نازش و ترفہ اور اترا ہٹ کا پیچ ہو تمام وہ اطوار جنمیں عبدیت و تواضع کے بجائے کبر و رعونت اور توجہ الی اللہ کے بجائے توجہ الی النفس ہوتی ہو ۔ اور تمام وہ کھانے جنمیں فضول خرچی اور اضاعۃ مال لازم آئے اور وہ سب ہی کفار کی شعار ہیں اسی آیۃ و حدیث سے ممنوع اور ناجائز ٹھہر گئے ۔ جنکی خصوصی تفصیلات دوسری آیات و احادیث نے کر دی ہیں جنکو ہم پہلی فصلوں میں بسط کیساتھ لکھ چکے ہیں ۔

پس جس حدیث کو سید صاحب جواز تشبہ میں استعمال کر رہے ہیں ۔ ہماری خیال میں وہی حدیث منع تشبہ کے لئے ایک زبردست استدلال ہے پھر عجیب بات ہے کہ سید صاحب تو آخر میں فرماتے ہیں کہ ۔

"ہم ان روایتوں سے کسی قسم کی پوشاک پہننے سے ممنوع نہیں معلوم ہوتے تو لفظ تشبہ کو مشابہت زی و لباس پر بھی حمل نہیں کر سکتے" (تہذیب الاخلاق ۱۲۹۰ھ ص)

اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجّال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

اس کی ساتھ ستر ہزار یہود طیلسان پہنے ہوئے ہونگے۔ حضور کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک مسلم جماعت کو دیکھا کہ وہ طیلسان پہنے ہوئے ہیں تو کراہت سے فرمایا۔

ما اشبہم بیہود خیبر۔	تعجب ہے کہ یہ لوگ خیبر کے یہود سے کس قدر مشابہ ہیں گئے۔

تو حضرت انس رض نے تو تشابہ کو مشابہت زی ولباس ... پر حمل کیا۔ اور سید صاحب صحابہ سے الگ ہو کر تشبہ کو مشابہت زی ولباس پر قطعاً حمل کرنا نہیں چاہتے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا

ابن قیم اس واقعہ کو نقل کرکے فرماتے ہیں۔

ومن ھھنا کرہ لبسہا من السلف والخلف لما روی ابوداؤد والحاکم فی المستدرک عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من تشبہ بقوم فھو منہم وفی الترمذی عنہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من تشبہ بقوم غیرنا۔ (زاد المعاد ص ج اول)	اور یہیں سے سلف وخلف نے طیلسان کا پہننا مکروہ سمجھا ہے۔ کیونکہ ابو داؤد نے ابن عمر سے اور انہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ جس نے کسی قوم کی ساتھ مشابہت پیدا کی وہ اسی قوم میں سے ہو گیا اور ترمذی میں یہ روایت ان لفظوں سے ہے کہ ہم میں سے نہیں ہے وہ شخص جس نے اغیار قوموں سے تشابہ کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء سلف وخلف نے بھی اس تشابہ کو زی ولباس پر محمول کیا ہے۔ پس جبکہ [illegible] علمائے [illegible] کے نزدیک اس حدیث کا محمل لباس اور زی وہیئت بھی رکھا گیا ہے تو ہمارے خیال میں سید صاحب کی [illegible] اس بارہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتی کہ اجماع امت کے مقابلہ میں قبول کیا جا سکے۔ انہیں شاید یہ ہے کہ وہ [illegible] کا پٹہ گلے سے اتار پھینکیں اور اسکے بجائے [illegible] کا طوق گردن میں ڈال لیں۔ نعوذ باللہ منہ۔

گیا کہ اگر حضورؐ لندن و جرمن میں آتے تو آپ کا لباس وہیں کے باشندوں کا سا (ہیٹ، کوٹ، پتلون وغیرہ) ہوتا۔ اور اس وہمی جز یہ سے مجتہدانہ طور پر فتویٰ یہ نکلا کہ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو نصرانیوں کا لباس پہننے میں کوئی شرعی حرج نہیں۔ ان چاروں اجزاء پر ہم جدا جدا نظر ڈالتے ہیں۔

صحابہ و مشرکین کی حُلّہ میں مشابہت

اوّل تو ہم حُلّہ کی حد تک تشبہ کا تعلق ہی تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ حُلّہ جس کے معنی چادرہ اور تہ بند کے ہیں فی نفسہٖ کوئی سورت اور وضع ہی نہیں بلکہ اصل لباس اور مادۂ لباس ہے۔ اور اسی لئے حالتِ احرام میں جبکہ ترکِ تزیّن کے دائرہ میں سلے ہوئے کپڑے کی ہر وضع قطع چھوڑ دیجاتی ہے تو اس اصل لباس (حُلّہ) ہی کو باقی رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ستر بدن کے لئے اس سے کم اور کم سے کم کوئی اور لباس ہی نہیں۔

پس یہ اصل لباس ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تشبّہ کا تعلق صُور و اوضاع سے ہے نہ کہ اُصول اور موادِ لباس سے اگر حُلّہ میں بھی منعِ تشبّہ کا حکم جاری کیا جائے تو اسکے معنے یہ نکلیں گے کہ اصل لباس اور مادۂ لباس کو چھوڑ دو اور عُریانی اختیار کرو۔ اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ مشابہت کفار کے خوف سے سرے سے کھانا پینا۔ ناک کان رکھنا۔ عبادۃ کرنا انسان رہنا بلکہ زندہ رہنا ہی ترک کرانے کی سعی کیجائے۔ حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ان جیسے اُصول امور سے تشبّہ کا کچھ بھی تعلق نہیں۔

(۲) پھر اگر تہ حُلّہ کو فی نفسہٖ نہ سہی لیکن فی غیرہ کوئی وضع تسلیم بھی کریں بایں معنی کہ یہ مادۂ لباس ہی کسی غیر مسلم قوم کا امتیازی شعار ہو جائے۔ جیسا کہ مشرکین مکہ کا تھا تو پھر ہم یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حُلّہ کو با قید و شرط اور بلا دخوہ تغییر بعینہٖ اسی طرح استعمال کرنا جائز قرار دیا جس طرح مشرکین پہنتے تھے۔ کیونکہ مشرکین تو اس حُلّہ کی ازار کو خیلا و تکبر سے ٹخنوں سے نیچے گھسٹتا ہوا پہنتے تھے اور آپ نے حکم دیا کہ

ازرۃ المؤمن الی نصف الساق ولا حرج | مؤمن کی ازار نصف پنڈلی تک ہے اور اگر

فیما فوق الکعبین ۔ | (نیچی بھی ہو لیکن ٹخنے نہ ڈھکیں تب بھی کوئی حرج نہیں ۔

مشرکین تو اپنی ردائیں قدموں سے دور تک گندی ہوئی استعمال کرتے اور اسبال کر کے ان کے دامنوں کو لٹکتا اور گھسٹتا چھوڑتے تھے ۔ جیسے عموماً متکبر سلاطین اور جابرہ کی چادروں کا یہی طرز ہے لیکن آپ نے اسبال کو اپنے اور اپنے صحابہ کے لئے حرام فرمایا ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حرمت محض منع تشبہ ہی کے مد میں نہ تھی کیونکہ اگر بالفرض آپ بلا ان قیود کے بعینہ مشرکین ہی کا سا رعونت نشان اور کبر آثار حلہ استعمال فرماتے تب بھی یہ تو ناممکن تھا کہ آپ کے مصفّیٰ قلب میں کبر و رعونت کے آثار راہ پا سکتے جو ان مشرکین کے تھے ۔ لیکن پھر بھی ان قیود کا اضافہ فرما کر حلہ کو استعمال فرمانا سوائے ترک تشبہ کے اور کس لئے ہو سکتا ہے ۔ اور اگر امت مرحومہ کی تاسی کے لئے تھا تو اسکی غایت بھی یہی نکلتی ہے کہ امت کو باطناً کبر و رعونت سے اور ظاہراً تشبہ بالاقوام سے الگ رکھا جائے ۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلہ استعمال فرمانا اور ان حدود کی رعایت کے ساتھ استعمال فرمانا منع تشبہ کی تو ایک کھلی دلیل بن سکتا ہے لیکن جواز تشبہ پر اس سے کیا روشنی پڑ سکتی ہے ۔ جو پیسہ صاحب کا منشا ہے ۔

(۳) لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے کہ آپ نے مشرکین مکہ ہی کا سا لباس پہنا اور مسلمین و مشرکین میں مشابہت بھی پیدا ہو گئی تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ یہ تشبہ عارضی اور چند روزہ تھا ۔ اسلئے قابل التفات نہ تھا ۔ کیونکہ کفار حجاز کے لئے اسلام اور قتل کے درمیان تیسری کا واسطہ ہی نہ تھا ۔ اسلئے مشرکین حجاز ذمی ہو کر نہیں رہ سکتے تھے ۔ بلکہ یا مسلمان ہو جانیوالے تھے یا مقتول اور جبکہ ہر صورت میں سرزمین حجاز ہمیشہ کے لئے غیر مسلم افراد سے پاک ہو جانیوالی تھی ۔ تو حجاز میں چند دن کے بعد تشبہ کا وجود ہی نہیں رہ سکتا تھا ۔ پس ایسے چند روزہ ظاہری تشابہ کے خوف سے حلہ جیسے زاہدانہ آثار لباس کو ترک کر دیا جاتا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا ۔

بہر حال اس جزیہ سے یا تشبہ بالکفار کا وجود ہی نہیں نکلتا یا نکلتا ہے ۔ تو اس کا بلا ترمیم و تنسیخ اور بغیر اقامت حدود زیر عمل آنا نہیں نکلتا اور اگر یہ بھی نکلتا ہے تو وہ عارضی اور چند روزہ ہے نیز جو

اقتداء کے دائرہ میں آکر ضروری الاتباع ہوگئیں خواہ وہ تعبدی ہوں یا تعودی اور اکل و شرب کے بارہ میں ہوں یا لباس اور وضع قطع کے۔

ادھر انہیں اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس بھی اقتدار کا قرآن نے حکم دیا۔ فاروق اعظم حلہ ثابت فرما رہے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے آذربائیجان کے عربوں کو حلہ پہننے ہی پر یہ کہکر آمادہ کیا ہے کہ وہ تمھارے باپ اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس ہے۔

فاتزروا وارتدوا وعلیکم بلباس ابیکم اسمٰعیل ؑ۔ (اقتضاء الصراط المستقیم)	ازار و ردا استعمال کرو اور اپنے باپ اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس پہننا ضروری سمجھو۔

پس آیۃ مسطورہ کے ماتحت حضورؐ کے لیے اس حلہ میں اقتداء اسلاف صالحین کا دخل آگیا تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے یہ لباس اپنی مشرک قوم کے رسم و رواج کے ماتحت پہنا۔

پس اس جسٹر یہ کی جو نکتہ چینیوں کے کلیہ کی اساس تھا بناء ہی منہدم ہوگئی جہ جائیکہ اسپر کلیات کی کوئی مضبوط عمارت کھڑی کر کے دکھلا دیجائے۔

پس اب نکتہ چینیوں کے لیے اس کے سوا کوئی میدان باقی نہیں ہے کہ وہ اس کلیہ کی بنیاد اس خاص جسٹریہ پر قائم کرنے کے بجائے کسی اور چیز پر قائم کریں جو ہمیں معلوم ہو تو پھر ہم محض اس کلیہ ہی کو سامنے رکھکر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی رسالۃ کی انتہائی توہین اور حضرت حق کے مقابلہ میں انتہائی جسارۃ و بیباکی ہے کیونکہ اسکے یہ معنی ہونگے کہ لباس یا عام معاشرۃ کے بارہ میں نبی کے پاس کوئی قلبی داعیہ کوئی اشارۂ باطن اور کوئی غیبی الہام نہیں ہوتا کہ وہ اس کا اتباع کرے بلکہ اس بارہ میں وہ بھی منجملہ آحاد ناس کے ایک فرد ہوتا ہے جو اپنی قومی معاشرۃ کا پابند اور رسم و رواج کا مقلد بنکر آتا ہو۔

اور پھر مقلد بھی اُسی قوم کا جس کی ہدایت کے لیے خود اسی کی بعثت ہوئی تھی۔ اور اس لیے ہوئی تھی کہ اس قوم کے عقائد و اعمال اور خیالات کے مصادر و مظاہر سب ہی اتنے بگڑ چکے تھے کہ نبوۃ کے سوا کوئی طاقت بھی اُس بگاڑ کی اصلاح نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر اوپر سے معاشرۃ کی اس کورانہ تقلید کا الزام اس عظیم الشان نبی پر بھی لگایا جائے جس نے دنیا میں آکر محض اپنی غیبی طاقت سے نہ صرف معاد ہی کی صلاح کی تھی بلکہ معاش اور تمدن کے بھی اچھے سے اچھے نمونے قائم فرمائے تھے۔ اور کوئی خلق و عمل صورت و سیرت۔ اور عادۃ و عبادۃ ایسی نہیں چھوڑی تھی جس کے متعلق اُمت مرحومہ کو ہدایت کی روشنی نہ دی ہو۔ جس کی علت کی جامعیت پر دشمنوں کو حسد ہی اسلئے تھا کہ وہ اتنی مکمل کیوں ہے؟ کہ اسمیں بول و براز تک کے آداب سکھلا دئے گئے ہیں۔ اور جس کے اکمال دین اور اتمام نعمت کو دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی ان طعن آمیز الفاظ میں تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ۔

مایدع ھذا الرجل شیئا الا خالفنا فیہ۔	یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی چیز بھی ہمی چھوڑنا نہیں چاہتا۔

کہ اُس میں ہمارا اختلاف نکرے یعنی اُس کی ملت کے کسی شعبہ کی بنا اغیار کے اتباع پر قائم نہیں بلکہ محض اپنی آوردہ ہدایت کی روشنی پر کہ لیلھا و نھارھا سواء۔

پس کسی نبی کا اور خصوصًا حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی معاملہ میں خواہ وہ لباس کا ہو یا تعبد کا خالی از الہام ربانی ماننا بلکہ اور اُلٹا اُسکو عامۂ اہل ہوئی کا تابع تسلیم کر لینا ایک ایسی ناروا جسارت ہے کہ ہر ایک اسلامی ضمیر بھی اسپر اظہار نفرت کرے گا اور اسلامی تعلیم بھی اسے شکر اسے بغیر نہ رہ سکیگی۔

قرآن کریم تو دعوی کرے کہ۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ۔	تمھارے لئے رسول اللہ میں بہترین نمونے ہیں۔

اور پھر اس اُسوہ حسنہ کو کسی خاص نوع عبادۃ۔ یا معاد یا معاش سے مقید نکرے بلکہ مطلقًا ہر علم و عمل کا نمونہ رسول میں ثابت کرے۔

پھر بیباکانہ دعوی کرے کہ علم و عمل نبی کی زبان کی ادنی حرکت بھی ہوئی کے تابع نہیں ہو سکتی

بلکہ صرف وحی کے

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ ۔	اور رسول ہوائے نفس سے کچھ نہیں بولتا وہ تو وحی ہوتی ہے جو اس کیطرف کی جاتی ہے۔

پھر یہ بھی بتلایئے کہ قول بھی بڑی چیز ہے نبی کے تو طبعی اور جبلّی اخلاق بھی پست اور ہوا پرستانہ نہیں ہوسکتے

وانک لعلیٰ خلق عظیم ۔	اور تو اسے نبی خلق عظیم پر ہے۔

جس سے پوری طرح کھل جائے کہ نبی کے عملی، قولی اور اخلاقی اسوے سب کے سب لامحالہ من اللہ ہی ہونگے۔ اور پھر یہ ہادی قرآن اسی پر بس نہ کرے بلکہ نبی کو کھلے لفظوں میں ہدایت بھی دے کہ۔

ثم جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون ۔	پھر ہم نے آپکو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا ہے سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیئے۔

جس سے بالکل یہ مسئلہ کھل جائے کہ معاش و معاد کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق رسول کے پاس غیبی الہام۔ اشارہ باطن اور داعیۂ قلب سلیم موجود نہو اور اُسے لباس وغیرہ میں عامۂ اہل ہوا کی پیروی کرنی پڑے۔ لیکن نکتہ چین جنکو فقہ باطن سے کوئی حصہ نہیں دیا گیا یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہ شرمائیں کہ انبیاء کی ذوات قدسی صفات تو جس مرز و بوم اور جس قوم میں مبعوث ہوتی ہیں اسی قوم کی معاشرت اور لباس کی پابندی پر مجبور ہوجاتی ہیں کہ ان کے پاس اس بارہ میں کوئی روشنی ہی نہیں ہوتی،

معاذ اللہ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا ۔

کیا یہ خدا کی بھیجی ہوئی رسالت کی تکذیب بلکہ موضوع رسالت کی تقلیب۔ اور قرآن کریم کی آیات بینات کا صریح مقابلہ و معارضہ نہیں ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ اگر آپ نگاہ حقیقت بین رکھتے تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی معاشرۃ اور لباس وغیرہ اُن کے نور تقویٰ و طہارۃ۔ صبر و قناعت زہد فی الدنیا اور رغبۃ فی الآخرۃ کے تابع ہوتے ہیں ان کے لباس پر انہی اخلاق فاضلہ کا رنگ چھایا رہتا ہے اُن کی معاشرۃ زاہدانہ اور قانعانہ ہوتی ہے۔ وہ تعلق مع اللہ اور رجوع و انابۃ الی اللہ بلکہ غنائے قلب کے سبب کم سے کم کھانے اور کم سے کم پہننے پر اپنے اشارات باطن سے ہر وقت راضی اور

مستفید رہتے ہیں۔

اسی لئے نہ اُن کے لباس میں اسراف کا دخل ہے نہ خُیلاء و تکبّر کا بلکہ ان کے لباس کی انواع و الوان اور اوضاع پر خاکساری و فروتنی اور عبدیت و تواضع چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ پس ان کا لباس ان کے قلبی اخلاق و جذبات اور باطنی دواعی کے تابع ہوتا ہے نہ کہ اقوام و اوطان کے رسم و رواج کے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کسی مرز و بوم اور کسی قوم میں بھی مبعوث ہوں اُن کے لباس کی نوعیت یکساں ہی رہی ہے اور وہ بیشتر حُلّہ (یعنی ردا و ازار) ہی ہوا ہے۔ کیونکہ حُلّہ انتہائی زہد و قناعت کا لباس ہے اور انبیاء علیہم السلام سے بڑھکر بسیط ارض پر کوئی زاہد نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تو نکتہ چینیوں کو بھی اعتراف ہے کہ آپ کا عمومی لباس یہی حلّہ تھا۔

نیز روایات صحیحہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا لباس بھی حُلّہ ہی تھا۔ چنانچہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حدیث میں ان کے لباس کے بارہ میں تصریح ہے۔

ان روح اللہ عیسیٰ نازل فیکم فاذا رأیتموہ فاعرفوہ فانہ رجل مربوع الی الحمرۃ والبیاض علیہ ثوبان ممصران (کنز العمال صفحہ ۲۰۲)

بلاشبہ عیسیٰ روح اللہ تم میں نازل ہونگے جب تم انہیں دیکھو تو ان کو اس حلیہ سے پہچان لینا کہ درمیانہ قد سرخ و سپید رنگ ہوگا اور ان کے بدن پر دو چادریں زرد رنگ کی ہوں گی الخ

حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی ہیں جو شام میں مبعوث ہوئے، اور وہ ملک بھی حجاز سے ٹھنڈا ہے لیکن پھر بھی حُلّہ کا استعمال فرمانا واضح کرتا ہے کہ حُلّہ میں حجاز کی کچھ وطنی خصوصیات نہ تھیں کہ کسی حجازی ہی میں پیدا ہونے والے نبی کا لباس بنے۔ بلکہ لباس کے دائرہ میں ملکی و قومی اصحاب زہد و تقویٰ کی انتہائی منزل یہی ہوسکتی ہے۔

نیز اسمٰعیل علیہ السلام کا لباس بھی حلّہ ہی تھا۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ کا فرمان آپ دیکھ چکے ہیں جس کے الفاظ یہ تھے۔

فاتزروا وارتدوا وعلیکم بلباس ابیکم ... ازار و ردا کا استعمال کرو اور اپنے باپ اسمٰعیل علیہ السلام ...

اسمٰعیل ۔ | کا لباس ضروری سمجھو۔

نیز ابراہیم علیہ السلام کا لباس بھی حلّہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ افعال حج درحقیقت افعال ابراہیمی کی نقل ہے اور ان میں احرام (جو حلّہ ہے) واجبات مناسک میں سے ہے۔ پس گویا اُمّت مسلمہ کے ہر شاہ و گدا پر لازم کر دیا گیا کہ کم سے کم ایک دفعہ عمر بھر میں لباس میں بھی ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا کرے۔

قرائن وشواہد

(۱) ۔۔۔ پھر اگر قرائن جمع کئے جائیں تو اُن سے بھی اندازہ ہو سکیگا کہ لباس انبیا حُلّہ ہی ہے۔ حدیث صحیح سے ثابت ہو چکا ہے کہ اہل جنّۃ کا لباس بھی حُلّہ ہی ہوگا۔ اور اہل معرفت لکھتے ہیں کہ تمام وہ نعمتیں جو جنّۃ کے ابتدائی درجات میں عوام مومنین پر فائض ہونگی۔ انبیا علیہم السلام پر دنیا ہی میں فائض کر دیجاتی ہیں۔ پس یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ انبیا علیہم السلام دنیا ہی میں اہل جنّۃ کی زیّ وہیئت اختیار فرمائیں کہ وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی جنّۃ ہی میں مقیم رہتے ہیں۔

(۲) نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیار سابق کی اقتدار کا حکم دیا گیا ہے۔

اولٰئک الذین ھدی اللہ	یہ ہی (انبیار مذکورین) ہیں کہ خدا نے انھیں سچے رستہ کی ہدایت
فبھدٰھم اقتدہ ٭	کی پس آپ بھی انکو خصائل میں ان کا اتباع کیجئے۔

اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ آیت میں اقتدار مطلق ذکر کی گئی ہے نہ اقتدار کو اخلاق سے مقید کیا گیا ہے نہ کسی قسم کے افعال و اعمال کی اُسمیں تخصیص کیگئی ہے۔ پس مطلقاً ہر غیر منسوخ شے میں اقتدار اسلاف مراد ہو گی جسمیں معاشرۃ و لباس بھی داخل ہے۔

اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آپ کا لباس حُلّہ ہے تو یہ قرینہ ہے کہ انبیار سابقین کی معاشرۃ بھی یہی ہو۔ تاکہ آپ کا لباس تک بھی دائرۂ اقتدار سے خارج نہو۔ پس انبیار سابقین کا لباس حُلّہ ہونا بطور اقتضار النص اسی آیۃ سے ثابت ہو جاتا ہے جو قطعیت کا مرتبہ لئے ہوئے ہے۔

(۳) نیز جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جیسی مکمّل و مکمّل ذات کے لئے اقتدار اسلاف کا حکم دیا گیا

تو عقل سلیم شہادۃ دیتی ہے کہ ضرور سابقین میں بھی ہر خلف کو اپنے سلف کی اقتدار کا حکم دیا گیا ہے اور دین کے آداب میں سے اس اتباع و اقتداء کو خصوصیت سے اہل دین کا امتیازی شعار بنا دیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس اصول اتباع و اقتدار کا طبعی تقاضا یہ ہو کہ ہر پچھلے نبی کی دینی معاشرۃ اگلے کی اقتدار میں ہو مثلاً جیسے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس عیسی علیہ السلام کی اقتدار میں ہو اسیطرح لباس عیسوی تابع ہے انبیاء توراۃ اور موسیٰ علیہ السلام کے اور اُن کا اُن سے سابق انبیاء کی اقتدار میں پس اس قرینہ سے بھی تمام انبیاء کا عمومی لباس حلّہ ہی نکل آتا ہے۔

(۴) نیز فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے عاشق نبوی کا قوم کو حُلّہ پر اُبھارنا اور اس بارے میں جناب خاتم الرسل صلے اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کی بجائے اسمٰعیل علیہ السلام کی اقتدا پر آمادہ کرنا بھی اسی کی دلیل ہے کہ حضورؐ کا اور اسمٰعیل علیہ السلام کا ایک ہی لباس تھا اور یہ کہ آپ نے اُنہی کی اقتدار میں حلّہ پہنا کیونکہ اس کا حاصل یہ ہوگا کہ تم لباس کے بارے میں اُن کی اقتدار کرو جنکی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کی اور جبکہ تم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع میں اسمٰعیلؑ کی اقتدار کروگے تو تمہیں دو اقتداؤں کا شرف ملیگا۔ ایک اقتدار محمدیؐ کا اور ایک اقتدار اسمٰعیلیؑ کا۔ غرض اس سے یہ واضح ہوگیا کہ زہد و قناعت کا لباس ہر قرن میں خواہ وہ عہد اسمٰعیلیؑ ہو یا عہد محمدیؐ ایک ہی نوعیت کا رہا ہے جس میں کسی مرز و بوم کی تمدنانہ خصوصیات کوئی اثر نہیں کر سکی ہیں۔

(۵) پھر مذہبی اقوام میں عام مقتدایان مذاہب و پیروان اسلاف کی لباسی سادگی بھی یہی بتلا رہی ہے کہ اُن کے پیشرو بھی لباس کے درجہ میں زہد و قناعت کے سبب حُلّہ ہی استعمال کرتے تھے جسکو جاہل اخلاف نے اپنی نافہمی اور مرور ایام کے سبب اسیطرح مسخ کر دیا جس طرح اُن کے مذاہب اور اصول و فروع کو مسخ کر دیا اور اپنے تعمق اور خوض کے سبب زہد و قناعت کی حدود سے گذر گئے۔

مثلاً جوگیوں نے اپنے پیشرؤں کی تقلید میں جانگیہ یا لنگوٹی اور انگوچھا اختیار کر لیا۔ یہ جانگیہ یا نصف تہ بند اُسی اصل تہ بند کا مسخ شدہ ہے۔ جس کو قناعت کے خوض میں آکر لنگوٹی تک ستایہ اس لئے پہونچایا گیا ہو کہ ان نافہم زہاد کے نزدیک واجب الستر اعضاء صرف آلات بول و براز ہو

بقیہ کا ستر واجب ہی نہ اور غیر واجب کے پیچھے پڑنا اسراف اور اضاعت سمجھکر صرف اس حد پر قناعت کرلیگئی ہو۔ لیکن ان میں سے جو پورا لباس پہنتے ہیں وہ تقریباً وہی ایک چادرہ اور تہ بند پر مشتمل ہوتا ہی گو اسکی اصلی ہیئت کو پھر بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ پس بہت ممکن ہی کہ جس طرح ان نادانوں نے اپنے اسلاف کا (جو بہت ممکن ہی کہ مردان حق ہوں) دین مسخ کر دیا اسی طرح ان کی معاشرۃ و لباس کو بھی مسخ بنا کر ان غیر فطری ہیئتوں تک پہنچا دیا ہی۔

یا مثلاً زہادین نے اقتدار اسلاف میں زہد کے تعمق سے اشتمال و احتبار شروع کر دیا۔ یعنی ایک چادرہ میں اوپر سے نیچے تک اپنے آپکو لپیٹ لینے پر اکتفا کر لیا اور یہ شاید اسلئے کیا گیا ہو کہ دو کپڑوں میں طوالت ثواب اور طوالۃ عمل تھی جسکو باعث تشویش اور خلاف زہد سمجھا ہو پس دو چادروں کے بجائے ایک ہی لفافہ استعمال کرنے لگے اور اصل حلّہ کو مسخ کر دیا۔ اور فقدان فراستہ کے سبب یہ نہ دیکھا کہ صرف ایک کپڑے سے ستر پوشی پوری طرح نہیں ہو سکتی جو کپڑے سے مقصود تھی۔ پس ایک جانب (زہد) کی رعایت میں منہمک ہو کر دوسرا اہم جوانب (مثلاً ستر و تعفف) کی رعایت کرنا بھول گئے اور اس نوع کے مقصود کو غیر مقصود سے بدل دیا۔

پس ان زہد میں تعمق رکھنے والی اقوام کو اپنے اسلاف کے زہد کی صورت تو یاد رہگئی کہ محسوس تھی مگر حقیقت پر تنبیہ نہ ہو سکا کہ وہ نور باطن ہی سے منکشف ہو سکتی ہی۔ اسلئے بلا حکمت و تفقہ انکی لباس (حلّہ) کی محض نقل اُتارنا شروع کر دی اور نافہمی سے اس کو اس مسوخ ہیئتہ تک پہونچا دیا کہ اس کی اصلی ہیئتہ گم ہو گئی۔

پس ہنود و یہود وغیرہ کے ان فنا فی المذہب اور مستہلک فی الزہد اشخاص کو دیکھکر اگر ہم اس نتیجہ پر پہونچیں تو بیجا ہو گا کہ ان کے اسلاف اور اولین داعیان مذاہب جنکی پیروی میں یہ اشخاص آجتک زہد و قناعت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور جنمیں سے بعض کے حقانی ہونے پر اور بعض کے بارہ میں ساکت کسی مرز دبوم کے ہوں اپنے لباس و معاشرۃ کے دائرہ میں کسی قومی اور وطنی رواج کے تابع نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے قلبی اخلاق و شمائل زہد و ورع۔ تقویٰ و استغنا اور قناعت کے ماتحت

انکی ایک ہی زاہدانہ اور قانعانہ وضع رہی ہے اور کسی مرز و بوم کے کسی تمدن نے اُن کو اس قناعت و زہد کے جادہ سے نہیں ڈگایا۔

ان واقعات و شواہد کے مقابلہ میں یہ کلیہ کسقدر مضحکہ انگیز اور طفلانہ بڑھے کہ ہر وطن کے انبیاء علیہم السلام اسی وطن کے رسم ورواج کے تابع ہوتے ہیں وہ لندن میں آئیں تو ہیٹ و کوٹ پہننے لگیں۔ ایران میں آئیں تو کج کلاہ بنجائیں، اور ہندوستان میں آئیں تو اچکن و چپکن اور بانکی پگڑیاں استعمال کرنے لگیں۔ یعنی ان کا کوئی اپنا داعیۂ قلبی ہی نہو۔ جس کی وہ پیروی کریں۔ بلکہ وہ بھی معاذاللہ ابناء وطن کی طرح بجائے تدین کے تمدن اور بجائے تمکن کے تلون ہی کے دلدادہ ہوکر دنیا میں آتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کی جیسی معاشرہ دیکھتے ہیں ویسا ہی کرنے لگتے ہیں۔

پھر صد حیرت و تعجب ہے کہ اس دور الحاد و دہریت اور بعید از اسلاف قرن میں تو ان دعاۃ مذاہب کے پیرو ہندوؤں کے جوگی۔ نصرانیوں کے راہب یہود کے احبار بودھ مت کے بھکشو اور مسلمانوں کے متصوفین دنیا کے مختلف سرد و گرم خطوں چین و جاپان اور ہندوایران وغیرہ میں اس قدیم زاہدانہ وضع کو اپنے فہم و مقدور کے موافق برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہیں اور کسی مرز و بوم کی خصوصیات اُن کی اس پختگی میں سستی پیدا نہ کرسکیں۔

لیکن وہ آپ کی "عقل سلیم" پھر بھی اسے ہی جائز تصور کرتی رہے کہ ان پیمبروں کے، اسلاف اگر آج ہند و ایران اور چین و جاپان وغیرہ میں ہوتے تو تمدنوں کے نقش قدم کی کورانہ تقلید میں لگ جاتے۔ اور دنیا کے موجودہ تمدن کی گہرائیاں اور معاشرت کے تعمقات انہیں پھسلا دیتے اور اُن کے زہد و قناعت کی کچھ بھی پیش نہ جاتی، گویا وہ تو زہد و تدین میں اپنے پیروؤں سے بھی گئے گذرے ہوجاتے۔ اور ان کے لکچر و تدین تب اپنے پیشرو وں سے بھی پیش پیش ہوجاتے۔ یا بالفاظ دیگر تدین کی جڑیں تو تمدن کی خشک سالی سے سوکھ جاتیں لیکن اسکی شاخیں پھر بھی ہری ہی رہتیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

بہرحال یہ کلیہ کسی طرح عقلاً۔ نقلاً۔ عرفاً۔ تجربۃً۔ مشاہدۃً باور کرنے کے قابل نہیں کہ انبیاء

علیہم السلام لباس و معاشرۃ میں اپنے ابناء وطن کے تابع اور ملکی خصوصیات کے زیر اثر ہوتے ہیں کیونکہ اس کے باور کر لینے میں حقیقی متبوع کا تابع ہونا اور تابع کا متبوع ہونا لازم آئیگا اور یہ موضوع رسالت کو اُلٹ دیتا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ ۔

(۶) جبکہ یہ کلیہ ہی ساقط الاعتبار اور محض فرضی رہگیا تو اس سے اس خاص جزیہ کا استنباط کرنا اور بھی زیادہ ناقابل وقعت اور غیر قابل التفات ہے کہ اگر "حضور لندن و جرمن میں آتے تو وہیں کے لوگوں کا سا لباس استعمال فرماتے"۔

لیکن تاہم اس جزیہ کو ہم بجائے لاشئے ہونے کے ایک شئے فرض کرکے کہتے ہیں کہ اول تو یہ محض ایک موہوم امر اور معلق حکم ہے کہ اگر آپ لندن آتے تو ایسا کرتے "کیونکہ اگر ایسا ہوجاتا تو بلاشبہ ہم بھی مان لیتے لیکن جبکہ ایسا نہیں ہُوا تو آپ ہی کو قبل از وقت واویلا کرنے کی کیا ضرورت داعی ہوئی اور آپ کیوں حقائق کو چھوڑ کر وہمیات کے جال میں پھنس گئے۔؟

لیکن میں کہتا ہوں کہ اس جزیہ کو شرطیہ بنانا اور لفظ "اگر" سے تعبیر کرنا غلط اور نادانی محض ہے بلکہ یوں کہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لندن و جرمن تشریف لیگئے اور پھر بھی وہاں کی زی و ہیئۃ کو ناپسند فرمایا اور کراہتہ کے سبب سے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ کسی موطن کی طرف جانا یا کسی چیز سے قریب و بعید ہونا محض مکان ہی کی حیثیت سے نہیں ہوتا بلکہ علم کی حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے۔

حق تعالےٰ بندوں سے اُن کی شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہیں لیکن علمی مسافت کے لحاظ سے نہ کہ مکان و زمان کے مسافۃ سے کہ وہ ان مخلوقات سے بہت بالا ہیں۔ حق تعالیٰ کو مخلوقات سے ہر آن معیتہ ہے لیکن نہ زمان و مکان کی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے کہ یہی اُن کی شان کے شایاں بھی ہے۔ اسیطرح جناب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان تمام ممالک میں تشریف لے گئے۔ لیکن نہ مکانی حرکتہ سے بلکہ علمی حرکتہ سے اور یہی آپ کی اعلیٰ شان کو زیب بھی دیتا تھا کیونکہ جب آپ نے علمی اور روحانی حیثیت سے لندنیوں اور جرمنیوں کے تمام اُن مخصوص لباسات سے ہمیشہ کیلئے مخالفت فرمادی جو کسی دور میں ان کا شعار اور مابہ الامتیاز قرار پا جائیں تو بلاشبہ آپ نے

لندن وجرمن کیطرف تشریف ارزانی فرمائی جو نقل مکانی سے کہیں بڑھکر قوی اور مفید احکام ثابت ہوئی۔ پس جبکہ ایک عالم کل اپنے گوشہ میں بیٹھکر تمام دنیا کے لئے دستورالعمل دیسکتا ہی۔ تو آپکو آخر کس چیز نے مجبور کیا ہی کہ آپ اس کے لئے دنیا کے ہر ہر گوشہ میں بھاگ دوڑ تجویز کریں اور اسکی شان سے گری ہوئی تکلیف کا اسے مکلف بتائیں۔

پس اب اگر ضرورت رہجاتی ہے تو صرف اسکے معلوم کرلینے کی کہ آج لندنیوں اور جرمنیوں کا وہ کونسا لباس ہے جس کو پہنکر ایک شخص لندنی اور جرمنی سمجھا جا سکتا ہی نہ کہ اس قضیہ شرطیہ کی کہ اگر حضورؐ لندن وجرمن میں آتے تو ایسا ہوتا۔

بہرحال یہ جزئیہ شرطیہ اس لحاظ سے تو نہایت مہمل اور لغو تھا ہی کہ اس کا مبنیٰ جو کلیہ بنایا گیا تھا وہی فرضی اور وہمی نکل آیا تھا۔ لیکن اگر صرف اس جزئیہ ہی کو مستقلاً سامنے رکھا جاسے تب بھی یہ واضح ہو جاتا ہی کہ اسکی حقیقت ایک منسوخ الرسم سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

پس اس فرضی جزئیہ پر قیاس کرکے سید صاحب کا یہ فتویٰ دینا کہ ہندوستانی مسلمان مشتری جہاز کی طرح ہر غیر قوم کے لباس کو بے تکلف اختیار کرکے اپنی غیرت وحمیت کا خون کریں اور بھی زیادہ لچر اور بے معنی ہوگا۔ اور اسکی کسی ایسے شخص سے توقع نہ کی جا سکے گی جس کو علم و فہم سے کوئی ادنیٰ حصہ عطا ہوا ہو۔

فصل

پانچواں شبہہ

سرسیدؒ تہذیب الاخلاق کے صفحہ ۱۴ پر قمطراز ہیں۔

کیا ادنیٰ مشابہت سے مثلاً دھوتی باندھ لینے سے یا انگھی و ترٹ پر چڑھنے سے یا ظاہری مشابہت کر لینے سے باوجود اقرار توحید و رسالت کے آدمی کافر ہو جاتا ہے؟ حاشا و کلا۔ پس اصل یہ ہے کہ یہ حدیث (من تشبّہ بقوم فھو منھم) روایتاً و درایتاً دونوں طرح پر مردود ہے"

اس شبہہ کو استفہام انکاری کی عبارت میں پیش کیا گیا ہے جس میں تشبّہ کے کفر ہونے کا انکار اور اسلئے اس کے جائز العمل ہونے کا اقرار پیش نظر ہے۔

اس استفہام انکاری اور اس کے جزو اقراری کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

کیا ہم تشبّہ کی ان چھوٹی چھوٹی جزئیات اور جزوی مشابہتوں سے کافر ہو جائیں گے؟"

"یعنی ہرگز کافر نہوں گے"۔ اور جب کافر نہوں گے تو پھر کفار سے اس ظاہری مشابہت پیدا کر لینے میں کیا حرج ہے؟ پس سوال کا منشا یہ نکلا کہ اگر تشبّہ سے کفر لازم آتا تب تو وہ قابل اجتناب چیز بنتا ورنہ نہیں۔ اس منشا کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھلے طور پر اس عبارت سے ایک دعویٰ تو یہ نکلا کہ۔

(۱) ممنوع اور منہی عنہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو کفر ہو۔

نیز جبکہ نکتہ چینیوں کے زعم میں تشبّہ کی یہ ظاہری اوضاع کفر تک نہیں پہونچاتیں اور ایمانی حقیقت پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا تو انکی اسی عبارت سے دوسرا دعویٰ یہ نکلا۔ کہ

(۲) ظاہر باطن میں مؤثر نہیں۔ یعنی ظاہری عمل باطنی کیفیات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

نیز اس استفہام میں تشبہ کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو تحقیر کے ساتھ رد کر دینے سے التزاماً ایک تیسرا دعویٰ یہ بھی نکلا کہ۔

(۳) کسی منہی عنہ یا مامور بہ کی عام جزئیات قابل التفات نہیں ہوتیں بلکہ مامور و منہی کا فی الجملہ امتثال کافی ہے۔ گویا اگر ترک تشبہ اور مخالفت کفار مطلوب بھی ہو تو اس امر کے ذریعہ صرف اس کی حقیقت مطلقہ طلب کی گئی ہے جو ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے اور ترک تشبہ کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ تارک تشبہ بننے کے لئے اسکی ہر ہر جزئی پر ہی عملدرآمد کیا جائے۔

شبہہ کے یہ تین عمود ہیں جن پر اس شبہہ کی تعمیر اٹھائی گئی ہے اگر یہ ستون گر پڑیں تو یقیناً ساری عمارت بھی اپنی چھت پر آ پڑیگی۔ اور نکتہ چین بے پناہ رہجائیں گے۔

ہم بتوفیق اللہ وعونہ ان تینوں من گھڑت اصول پر جدا جدا تنقیدی نظر ڈالیں گے تاکہ شبہہ کا یہ نظر فریب طلسم کھلجائے۔ اور سراب کے بجائے پیاسوں کے لئے آب حیات ظلمتوں سے نکل آئے۔

کیا منہی عنہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو کفر ہو؟

نکتہ چینوں کا یہ اصول کہ منہی عنہ وہی چیز ہو سکتی ہے جو کفر ہو۔ ایک کھلی ہوئی نادانی اور لغویت ہے۔ کیا اگر تشبہ اسلئے ممنوع نہ رہے کہ وہ اپنے تمام شعبوں کے لحاظ سے کفر نہیں تو ان نکتہ چینوں کے نزدیک شراب خواری۔ قمار بازی۔ زناکاری۔ دروغ گوئی۔ بہتان بندی۔ [illegible] غیبت شعاری تفرقہ اندازی۔ فتنہ پردازی وغیرہ تمام کبائر بھی ممنوع نہ رہیں گے کہ وہ بھی کفر نہیں ہیں اور آدمی محض ان افعال کے ارتکاب سے کافر نہیں ہو جاتا۔ اگر یہ اصول نکتہ چینوں کے نزدیک [illegible] اسقدر مسلم تھا تو کیا اچھا ہوتا کہ تہذیب الاخلاق کے چند صفحات [illegible]

تروشنی ڈالتے جس طرح انہوں نے جواز تشبہ پر رقم نمائی کی ہے۔

پھر یہ عجیب قسم کا اصول موضوعہ ہے کہ جس فعل کے ارتکاب سے آدمی کافر ہو وہ فعل جائز بھی ہونا چاہیئے۔ اسکے تو یہ معنی ہیں کہ کفر تو معصیت ہو سکتا ہے، لیکن دنیا بھر کا فسق و فجور اور اسکے تمام شعبے کوئی معصیت اور قباحت نہوں۔ گویا کفر سے تو آدمی کو ڈرنا چاہیئے لیکن معصیت اور فجور سے گھبرانیکی کوئی ضرورت نہیں یا بالفاظ دیگر خلود فی النار سے تو بچنا قرین عقل ہے لیکن دخول فی النار سے بچنے کی سعی محض ایک غیر ضروری جد و جہد ہے۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جسے معاصی اور فجور کا خوف نہیں اُسے کفر کا بھی قطعاً خوف نہیں۔ جو لوگ کسی نتیجہ کے مبادی اور وسائل سے نہیں گھبراتے وہ یقیناً اس نتیجہ سے بھی نہیں گھبراتے جو لوگ نگاہ بازی اور لمس اجنبیات سے نہیں بچنا چاہتے وہ زنا سے بھی نہیں بچنا چاہتے کہ یہ چیزیں مستقلاً کوئی حقیقت ہی اسکے سوا نہیں رکھتیں کہ وہ زنا کے ذرائع ہیں۔ جو لوگ راتوں کو مال کی تاک جھانک۔ نقب زنی اور مکانات کے بھید لینے سے نہیں گھبراتے وہ یقیناً سرقہ سے بھی نہیں گھبراتے کہ یہ چیزیں وسائل سرقہ ہونے کے سوا یا لا مبالہ کچھ بھی نہیں ہیں۔

پس جو لوگ کفار کی صُوری مشابہت سے نہیں گھبراتے وہ یقیناً ان کی باطنی مشابہت سے بھی نہیں گھبرائیں گے۔ کہ یہ ظاہری مشابہت ہی باطنی مشابہت کا ایک قوی ذریعہ ہونے کے سوا اور کیا وجود رکھتی ہے۔ اور اس باطنی مشابہت ہی کا نام کفر ہے۔ ایسی ہی مواقع کے لئے صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے۔

ایاکم و محقرات الذنوب - حقیر حقیر گناہوں سے بہت پرہیز کرو کہ وہی عظیم گناہوں کا پیش خیمہ ہیں۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسے خفیف المعیار لوگ تشبہ سے اگر وہ کفر صریح بھی ہو تا ہرگز نہ گھبراتے اور ضرور اپنی ہوا کے موافق تشبہ کا ارتکاب کرتے۔ تشبہ کو اُن کا یہ کہکر جائز بتلانا کہ وہ کفر نہیں محض ایک فریب اور شریعت کو دھوکہ دینا ہے۔

ممکن ہے اُن کا یہ فریب کسی جاہل مخلوق پر چلجائے لیکن خدائے علیم پر تو نہیں چلسکتا۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا باخلق آری جملہ راست	با خدا تدبیر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن	رایت اخلاص و صدق افراشتن
اگر گھے اللہ دروغ میزنی	از برائے مسکہ دوغے میزنی

پس وہ خدا کو دھوکہ دینے کا ارادہ کر کے سخت دھوکہ میں ہیں کہ اپنے ہی نفوس کو دھوکہ دیرہے ہیں وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا۔

لیکن بہرحال اگر مان لیا جائے کہ تشبہ بالکفار کا کوئی شعبہ بھی کفر نہو تو کفر کی نفی سے اسکے ممنوع ہونے کی نفی کیسے ہوگئی۔ یعنی محض نفی کفر سے تشبہ کا جواز کیسے ثابت ہوگیا؟ اور جب نہ ثابت ہوا تو نکتہ چینیوں کے اس نفی کفر کے استدلال سے ہمارے مقصد حرمت تشبہ پر کوئی بھی اثر نہ پڑا۔ ہوسکتا ہے کہ تشبہ مطلق کفر نہو لیکن حرام ہو۔ پس جبکہ نکتہ چینیوں کے ناقص طرز استدلال سے انکی خلاف مرضی تشبہ کا باوجود کفر نہونے کے منہی عنہ ہونا لازم آگیا تو سوال یہ ہے کہ یہ منہی عنہ تشبہ آپ کے نزدیک طاعت ہے یا معصیت؟ اگر طاعت ہے تو پھر آپ کو اس اُصول کے موافق یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ زنا و شراب اور قمار و غیبت وغیرہ بھی باوجود ممنوع ہونے کے طاعات ہیں۔ لیکن اگر آپ تشبہ کو معصیت مانتے ہیں تو پھر آپ کی اس عبارت کو حل کرنے سے ہم قاصر ہیں کہ مسلمان مسلمان رہکر خواہ کسی قوم سے تشبہ کرے خواہ وہ شعائر دینیہ ہی میں ہو کوئی حرج نہیں۔ کیا ممنوعات شرعیہ اور قبائح دینیہ کا ارتکاب آپ کے نزدیک کچھ اسوان یا مستحسن فعل ہوتا۔ اگر ایسا تھا اور اسکے ارتکاب میں کوئی حرج نہ تھا تو پھر آخر شریعت کو اسکے ممنوع قرار دینے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ کیا محض ان دو نقیضوں کے جمع کر دینے ہی کی ضرورت تھی کہ لوگ [illegible] شریعت بھی سمجھیں اور پھر اس ممنوع کے کر لینے میں کوئی حرج بھی خیال نہ کریں۔

ممکن ہے کہ یہ آپ کی کوئی اصطلاح ہو کہ ممنوعات شرعیہ تو لا اس کے درجہ میں ہوں

اور واجبات شرعیہ فیہ نظر کے دائرہ ہیں۔

بہرحال نکتہ چینوں کا یہ اصول کہ منہی عنہ صرف وہی ہو سکتا ہی جو کفر ہو۔ سرتاسر غلط اور نہ صرف غلط بلکہ دائرہ اسلام میں ایک ناقابل تلافی فتنہ پردازی ہے۔ بندوں کو خدا پر جری کرنا اور صغائر و کبائر کی چراگاہوں میں آزاد چھوڑ دیتا ہی۔ پس بقول سید صاحب کے اگر دھوتی باندھنے یا مکھی پر چڑھنے یا عام مشابہتہ کفار پیدا کر لینے سے وہ کافر نہیں ہو سکتے تو بقول ہمارے یہ امور جائز بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ کسی چیز کے ممنوع ہونے کے لئے کفر ہی ہونا ضروری نہیں ہے۔

۳۷

ظاہری اعمال کا باطنی کیفیات پر اثر

نکتہ چینوں کے شبہہ کا دوسرا جزو یہ کہ ان ظاہری اوضاع و اطوار کو باطنی حقائق سے کوئی تعلق نہیں اگر ایک مسلمان سر سے پیر تک نصرانی صورت اور یہودی ہیئت بنجائے تو کیا اسکے اعتراف توحید و رسالت میں کوئی فرق آجائیگا۔؟ کبھی نہیں کیونکہ یہ اعتراف قلب سے متعلق ہی اور یہ اوضاع و اطوار کے تغیرات محض ظاہر سے جنکا قلب سے کوئی واسطہ نہیں۔ پھر اس ظاہری تشبہ بالکفار پر کیوں خواہ مخواہ لے دے مچائی جائے اور اسکو مضرۃ شرعیہ پکارا جائے۔

ظواہر کا مسخ ہو جانا بھی بدترین عیب ہے

(۱) ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم کرتے ہیں کہ اس ظاہری تغیر تبدل سے اسلام کی روح کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ اور کسی طرح تشبہ بالاقوام سے اسلام کی حقیقت (ایمان) فنا نہیں ہو جاتی۔ لیکن اگر حقیقت باقی رہتے ہوئے بھی ہیئت بگڑ جائے تو کیا یہ ظاہری صورت کا بگڑ جانا کچھ کم عیب شمار کیا جاتا ہی؟ اور کیا دنیا اپنے ظاہر کو آراستہ کرنے اور نمائش کا ہر اچھے سے اچھا

پہلو اختیار کرنے میں کوشاں نہیں رہتی؟ پھر غریب اسلام ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ ان حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ اور اس کی تمام ظاہری اوضاع کو یک قلم ہٹا دینے کی سعی بیہودہ کی جائے۔

کیا کوئی دیوانہ اور سڑی بھی یہ گوارا کر سکتا ہے کہ چونکہ جسم کی بدنمائی اور ظاہر کی بدہیئتی سے رُوح پرواز نہیں کر جاتی۔ اسلئے اپنے یا اپنے کسی محبوب کے چہرے پر سیاہی مل دیتے چند اعضا کو کاٹ تراش دینے بدن پر جگہ جگہ داغ دیتے اور زخم ڈالدینے میں کوئی باک نہ کرے اور اسپر قناعت کرکے بیٹھ جائے کہ رُوح موجود اور زندگی باقی ہے۔

پس اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ظاہری تشابہ کا کوئی اثر باطن تک نہیں پہونچتا۔ تب بھی ظاہری تشبہ کے آثار کم از کم ظاہر ہی پر ایسے بدنما پڑتے ہیں کہ اُن کے لئے کوئی تلافی و تدارک نہیں اور کسی چیز کی محض صورت جسمانی کا مسخ ہو جانا بھی کوئی کم عیب نہیں۔

ایک لنگڑا۔ لنجا۔ اندھا۔ مقطوع الاطراف اور دنیا بھر کا ٹھی انسان بھی باوجود عیوب سے پُر اور عاجز و بیکار ہونے کے انسان بھی پکارا جاتا اور زندہ بھی رہتا ہے لیکن کیا آپ اس کیلئے ایسی زندگی پسند کرتے ہیں یا اپنے لئے صرف ایسی ہی زندگی پر بخوشی قناعت کر سکتے ہیں؟ نہیں تو پھر اسلام کے لئے اس عاجزانہ اور ادھوری زندگی پر قانع بنجانے کا داعیہ آخر آپکے قلوب نے کہاں سے پیدا کر لیا؟ اور کسطرح دانشمندوں کی عقلوں نے گوارہ کیا کہ وہ دین کے ایک حصّے (ایمان قلبی) پر قناعت کر کے دوسرے حصّے (اسلام ظاہری) کو برباد چھوڑ دیں۔

حالانکہ یہ ظاہر و باطن یا اسلام و ایمان ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں جن میں سے نہ تو کسی ایک پر قناعت ہی کیجا سکتی ہے۔ اور نہ ایک کے بغیر دوسرا باقی ہی رہ سکتا ہے اسی لئے ابن شاہین نے علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ۔

الایمان والاسلام قرینان لا یصلح واحد منہما الا مع صاحبہ۔ (کنز العمال)	ایمان اور اسلام دو ساتھی ہیں جنمیں کوئی ایک بغیر دوسرے کے بحال نہیں رہسکتا۔

نیز ایک حصۂ دین (ایمان) کو لے لینا اور ایک حصۂ دین (اسلام) کو ترک کر بیٹھنا قطع نظر

ان حصول کی بقاء وعدم بقاء کے یہ تو یہودیت کا وہی شیوۂ ایمان بالبعض وکفر بالبعض ہوگا۔ جسکے ایمان کو بھی قرآن نے کفر ہی کہا ہے۔

ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولئک ھم الکفرون حقا۔ نعوذ باللہ منہ۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض باتوں کو مانتے ہیں اور بعض کے منکر ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ (ایمان وکفر کے درمیان) ایک راستہ دنیا، بنالیں۔ وہ بلاشبہہ کافر ہیں۔

یہ بحث صرف اس تقدیر پر تھی کہ ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے نکتہ چینوں کیطرح مان لیں کہ یہ ظاہری تغیرات باطن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن اب ہم اس بالفرض سے آگے بڑھکر وہی کہتے ہیں جو حقیقت ہے اور جسکو پیش نظر رکھکر ہی شریعت نے ظاہری مشابہتوں کی ممانعت کی ہے۔

ظواہر کی تاثیرات بواطن پر

(۳) اور وہ یہ کہ شرعیات ہی میں نہیں بلکہ کائنات کے ہر ایک محسوس ذرّے میں ظاہری پیرائے اور پھر اُن ظاہری پیراؤں کی حرکات وسکنات بواطن میں اچھا اور بُرا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اگر پیرایوں پر کوئی تعمیری عمل کیا جائیگا تو حقائق تعمیری اثر قبول کرلیں گی اور اگر تخریبی عمل ہوگا تو حقائق بھی تخریب کا ہی اثر لے لینگی۔

کیونکہ یہ دنیا نہ تو محض معانی وحقائق کا عالم ہے کہ اسمیں حقائق وارواح بغیر پیرایوں اور اجسام کے تھم سکیں۔ اور نہ محض اجسام وصُور ہی کا عالم ہے کہ اس میں اجسام بغیر ارواح کے باقی رہجائیں۔ بلکہ رُوح وجسم۔ ظاہر وباطن اور حقیقت وہیئت سے ترکیب دیکر اس کائنات کو استوار کیا گیا ہے۔

پھر اس مرکب کائنات کے صناع نے اپنی بے پایاں حکمت سے اجسام کو تو عمل سپرد کیا اور ارواح میں قوتِ عمل ودیعت کئے یعنی ارواح کو تو مصادر اعمال کا مخزن بنادیا اور اجسام کو مظاہر اعمال کا۔ اور پھر جو نسبت رُوح وجسم میں قائم کی تھی وہی بعینہ رُوحانی ملکات اور

جسمانی اعمال میں قائم فرمادی یعنی جس طرح رُوح اپنے قیام میں جسم کی محتاج تھی اور جسم اپنی بقا میں رُوح کا بعینہ اسیطرح اخلاق و اعمال میں ایک رشتہ ارتباط قائم کیا کہ اخلاق و ملکات اپنے قیام و استحکام اور رسوخ میں اعمال کے محتاج ہیں اور اعمال اپنے وجود و ظہور اور بقا و ترقی میں اخلاق کے دستنگر ہیں۔

پس اگر روحانی قوی و ملکات نہوں تو اعمال بجائے اپنی نمائش کرنے کے پردۂ عدم میں مستور رہجائیں اور اگر اعمال کا ظہور اور تتابع نہو تو اخلاق و ملکات اور روحانی استعدادیں بجائے راسخ و مستحکم ہونے کے زائل ہونے لگیں۔

پس اس سے یہ نتیجہ واضح طور پر نمایاں ہوگیا کہ رُوح تو اپنے باطنی قوی سے وجود کا اثر ڈالتی ہے اور اجسام اپنے ظاہری اعمال سے ان روحانی قوی پر رسُوخ و استحکام کا۔ اور پھر اس نتیجہ سے ایک اور نتیجہ یہ بھی کھل گیا۔ کہ اگر جوارح سے خوشنما اعمال سرزد ہوں تو رُوح پر بہترین آثار ڈالیں گے اور اگر بدنما اور مسخ شدہ اعمال صادر ہوں تو رُوح پر بدترین آثار ڈالیں گے اور اسطرح پیرایوں کی خوشنمائی و بدنمائی اور تعمیر و تخریب روح تک نیک و بد اور آبادی و بربادی کے آثار پہونچاتی رہیگی۔

غرض روح و جسم یا اخلاق و اعمال میں جانبین سے تاثیر و تاثر کا ایک سلسلہ قائم ہی جس سے کوئی نامی اور ذی رُوح مخلوق نباتات ہوں یا حیوانات پھر کائنات کی عام موجودات اعیان ہوں یا اعراض مستثنیٰ نہیں ہیں۔

تاثیرات ظاہر محسوسات میں

مثال کے طور پر پہلے نباتات ہی کو لے لو۔ پھولوں کی معنویت (خوشبو) اُن کے اوراق اور نازک پتیوں میں مقیّد ہے۔ اگر گلاب یا یاسمن کی ان سُرخ و سپید پنکھڑیوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے تو یقیناً ان کی خوشبو بھی منتشر ہوکر معدوم ہو جائیگی۔ حالانکہ یہ قطع و برید براہ راست خوشبو پر نہیں واقع ہوئی بلکہ پتیوں پر لیکن پھر بھی پیرایہ کے تغیر سے حقیقت کم و قدر جلد

بیتغیر ہو گئی۔

خود انسان ہی میں دیکھ لو کہ مثلاً اس کی نگاہ کی لطیف طاقت آنکھ کے پردہ میں کارفرما ہے اور سماعت کی قوۃ پردہ گوش میں اگر حدقہ چشم یا پردہ گوش کو توڑ پھوڑ دیا جائے تو کیا یہ باطنی قوی بصارت و سماعت باقی رہ سکتے ہیں۔ یا اگر پورے جسم کو پاش پاش کر دیا جائے تو کیا رُوح اور زندگی پھر بھی قائم رہ سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! حالانکہ یہ تمام تغیرات ظواہر پر کئے گئے تھے نہ کہ براہ راست بواطن پر۔ لیکن پھر بھی ان ظواہر کا تغیر بواطن تک کس سرعت کے ساتھ پہونچ گیا اور پھر کیسی مطابقت کے ساتھ پہونچا کہ جس درجہ پیرائے متاثر ہوئے اسی درجہ میں حقائق بھی متاثر ہو گئیں یہانتک کہ اب یہ بھی کسی کے بس میں نہ رہا کہ اگر بینائی کی طاقت کا خانہ ظہور ویران ہو گیا تھا تو اُسے ہاتھ پاؤں یا بدن کے کسی اور گوشہ ہی میں جگہ دیکر ٹھیرا لیا جائے۔

اسی طرح علوم اور اعراض کے سلسلہ پر نگاہ ڈالو تو وہاں بھی اس تاثیر و تاثر کا سلسلہ کھلا ہوا نظر آئیگا۔ ایک فصیح و بلیغ عبارۃ کی معنویت اس کے الفاظ میں پنہاں رہتی ہے۔ اگر الفاظ کو مسخ کر دیا جائے یا تعبیرات بدلدی جائیں تو ان الفاظ کی ساتھہ ساتھہ وہ معانی بھی رخصت ہو جائینگے جو ان الفاظ کی قبا میں جلوہ آرا تھے حالانکہ یہ محو و اِمحا صرف عالم الفاظ میں کیا گیا تھا نہ کہ معانی میں۔ مگر معانی کا قیام ہی جبکہ ان الفاظ کے پیرایوں کی بدولت تھا تو پیرایہ مٹتے ہی وہ بھی رخصت ہو گئے۔

پھر بھی الفاظ یعنی معانی کے ظاہری پیرائے جو نوک زبان سے ادا کئے جاتے ہیں انسانی ارواح میں اس درجہ موثر ہیں کہ شاید تیر و تفنگ کے گہرے زخم بھی ایسی تاثیرات پیدا نکر سکیں اگر کسی کو گالی دیدیجائے تو محض اس ایک لفظ کی بدولت جو ممکن ہے کہ محض غلط ہی کہا گیا ہو مخاطب کا خون جوش کھانے لگتا ہے اور اس کے نفس میں ایک زبردست انقلاب ہیجان رُونما ہو جاتا ہے۔

جراحات السنان لها التیام	ولا یلتام ما جرح اللسان

اور کسی جوش میں بھڑکے ہوئے انسان کے کانوں تک چند نرم اور مہذب الفاظ خلیقانہ اور متواضعانہ
لہجہ سے پہونچادیے جائیں تو پھر دیکھو کہ اسی آن اس کا جوش کس طرح ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔

اگر ظواہر اپنے بواطن تک آثار نہیں پہونچاتے اور اگر عالم الفاظ عالم معانی میں موثر نہیں اور اعمال
کی کوئی تاثیر اخلاق پر نہیں تو پھر آخر یہ انقلابات کیا ہیں؟ یہ فنا و بقا رحقائق کیا معنی رکھتی ہے؟ اور
ارواح میں ہیجان وسکون اور تموج وتلاطم کیسا ہے؟۔

پھر کیا کتنے چینیوں نے کبھی اپنے اندر اس کا مشاہدہ نہیں کیا کہ اگر غسل کے ذریعہ بدن کو صاف
ستھرا کیا جائے تو روح بشاشت کے آثار قبول کر لیتی ہے اور مکدر اور گندہ رکھا جائے تو روح تک بھی
یہی تکدر سرایت کرنے لگتا ہے۔ اگر صاف ستھرے کپڑے ہوں تو روح میں انبساط کی کیفیات جوشزن
ہونے لگتی ہیں۔ اور اگر میلے کچیلے کپڑے ہوں تو روح میں انقباض کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔
اگر کپڑوں پر عطریات چھڑکے ہوئے ہوں تو روح میں مسرّۃ وشادمانی کے جذبات ابھرنے لگتے
ہیں اور اگر نجاسات لگی ہوئی ہوں تو اسمیں تکدر وبے چینی کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔

حالانکہ مادیات وروحانیات میں ماہیت وحقیقت کے اعتبار سے بونِ بعید بلکہ تضاد کی
نسبت ہے لیکن پھر بھی اس قدرتی جوار واتصال کے سبب یہ روحانیات اپنی اضداد سے آثار قبول
کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، اور ظاہر جسم کی طہارت ونجاست سے خود متاثر ہونے لگتی ہیں۔

تو پھر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ بدن اور کپڑوں پر اگر معنوی نجاست وکثافت یا معنوی لطافت
وپاکیزگی سرایت کر جائے تو اس معنوی اشتراک کے سبب روح اور بھی زیادہ اس لطافت وکثافت
معنوی سے متاثر ہو، اور ویسے ہی نجاست وکثافت آثار قبول کرے جیسے اس کے بدن یا لباس نے
قبول کر لئے تھے۔

ہمارے نزدیک اور ہر اس شخص کے نزدیک جو دیدۂ بصارت کے ساتھ چشم بصیرت رکھتا ہو۔
ضروری ہے کہ بدن، لباس، غذا وغیرہ کی معنوی کثافت یعنی انکی وہ وضع واطوار جو خلاف شریعت ہونیکے
سبب شرعی حدود سے متجاوز ہوں، اور جن میں دین کا وہ ہی حصہ یعنی نکیا گیا ہو جو

مرضیٔ الٰہی و پسندیدۂ بارگاہ رسالت پناہی ہے۔ اور اسیطرح بدن لباس کی معنوی لطافت یعنی وہ اوضاع و اطوار جنکا تجمل و تزین سنت کے موافق اور حدود شرعیہ کے دائرہ میں ہو اپنی ان معنوی آثار سمیت قلب تک سرایت کرتی ہواور قلب وہی کیفیات قبول کرنے جو اس ظاہری قالب نے قبول کی تھے

ہمارا مدعیٰ اور تجربیات

چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ انسانی تجمل و تزین کی مختلف لباسی اور بدنی شکلیں اور وضع و تراش کی متنوع ہیئتیں خود اسی انسان کے باطن پر موثر ہوکر اسے بناتی اور بگاڑتی رہتی اور اس کے اخلاق باطنی میں کھلا ہوا انقلاب پیدا کرتی رہتی ہیں

اگر ایک جوانمرد اور بہادر انسان نازک لباس بیش بہا زیورات اور غیر معمولی ناز و تنعم کی ہیئتیں اختیار کر لیتا اور اپنے ظاہری وجود کو مزین بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے تو چند ہی دن کے بعد اس جوانمردی و دلاوری اور جفاکشی کے بجائے اس کا باطنی عالم (قلب) بزدلی و تن آسانی اور آرائش و عیش پسندی کے نسوانی جذبات کو قبول کرنے لگتا ہے وہ اس کے تمام شجاعانہ جذبات خاک میں ملجاتے ہیں اور جس طرح اس نے اپنے ظاہر کو نسوانی اعمال کا زیر مشق بنایا تھا اسی طرح اسکا باطن بھی انہی نسوانی جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔

اسیطرح ایک انسان اگر بتکلف امراء کا لباس اختیار کرتا ہے تو اس لباس کے تمام لوازم تجبر و تفاخر یا تحقیر ناس وغیرہ اسکے قلب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اگر فقراء و مساکین کی ہیئت اختیار کرتا ہے تو اس زی و ہیئت کے لوازم فقر و تواضع اور خاکساری و فروتنی اسکے باطن کو رنگ دیتے ہیں اگر علماء و مشائخ کی طرز و وضع ظاہر پر چسپاں کرتا ہے۔ تو اس کے آثار ورع و تقویٰ اور حیاء و تدین سے اسکا باطنی جہان روشن ہو جاتا ہے اور اگر سفیہوں بیوقوفوں یا شاطروں کا لباس اختیار کرتا ہے تو پھر یقیناً چالاکی و عیاری اور مفسدہ پردازی وغیرہ کے جذبات قلب میں رسوخ پیدا کرلیتے ہیں اور اس سے اسی قسم کے اعمال کا عادۃً ظہور پذیر ہونا بعید نہیں رہتا۔

سخت حیرت ہے نکتہ چینوں پر کہ ظواہر کی یہ قطعی اور واقعی تاثیرات جب ان کے سامنے آتی

ہیں تو وہ اس حیثیت سے تو انھیں بلا چون وچرا تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ ان کے عینی مشاہدات ہیں لیکن اس حیثیت سے وہ ان تمام مشاہدات کو رد کر ڈالتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسل نے تشریعی حیثیت سے بھی انھیں اسی طرح تسلیم کر لیا ہے گویا اُن کو اپنی آنکھ پر اس سے بھی زیادہ اعتماد ہے کہ جتنا انکو خدا کی رسالت اور اخبار وحی پر ہونا چاہیئے تھا۔ حالانکہ ایمان صرف اُسی اقرار و اعتراف کا نام تھا جو محض انبیاء علیہم السلام اور وحی الٰہی کے اعتماد و یقین پر کیا جائے اور دنیا کے سارے مشاہدات سے کہیں بڑھکر اسے قطعی اور واقعی سمجھا جائے۔ بہرحال وہ مانیں یا نہ مانیں لیکن شریعت ان مشاہدات سے زیادہ اور کیا کہتی ہے؟ اور اس کا دعویٰ اسکے سوا کیا ہے کہ یہ ظاہری افعال کا تکرار اور اُن کا بار بار دُھرانا قلوب میں ایک ملکہ نفسانیہ کے راسخ ہونے کا سبب بن جاتا ہے اگر ایک شخص خیر کے افعال کا بار بار اعادہ و تکرار کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ اُس کے قلب میں خیر کے ملکات اور نورانی آثار راسخ ہو جائیں۔ اور اگر شر کی ارتکاب کی عادۃ ڈال رہا ہے تو قلب میں شر کے دواعی اور ظلمانی آثار پیدا ہو جائیں خواہ یہ ظاہری افعال تدین کے متعلق ہوں یا تمدن کے دینی اُمور ہوں یا معاشرتی۔

شرعیات اور تاثیر ظاہر

خیر کے سلسلہ میں شریعت نے تصریحات کی ہیں کہ جوارح کے اعمال، لباس کی انواع اور کپڑوں کی اقسام ایمان کی کیفیات پر زیادتی۔ اور کمی کا اثر ڈالتی ہیں۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ صوف کا پہننا جو محض ایک ظاہری فعل ہے ایمان کی حلاوۃ پیدا کر دیتا ہے جو محض ایک باطنی کیفیت ہے

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یجد حلاوۃ الایمان فلیلبس الصوف۔ (کنز العمال)	جس ایمان کی حلاوۃ پسند ہو اُسے چاہیے کہ صوف پہنے!

حدیث میں فرمایا گیا کہ عمامہ باندھنے سے حلم اور وقار کی کیفیت قلب میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اعتموا تزدادوا حلما (کنز العمال)۔	عمامہ باندھا کرو حلم بڑھ جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ نماز میں صفیں سیدھی رکھو گے تو قلوب میں بھی راستی و استقامت

پیدا ہو جائیگی ورنہ کجی واختلاف۔

استووا تستوقلوبکم ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم۔	(صفوف صلوٰۃ میں) سیدھے رہو تو تمہارے قلوب سیدھے ہو جائینگے۔ آگے پیچھے مت ہو ورنہ قلوب بھی اسی طرح آگے پیچھے اور متفرق ہو جائیں گے۔

حدیث میں خبر دی گئی کہ اگر علم پر جوارح سے عمل کروگے تو قلوب میں نئے نئے علوم پیدا ہو جائیں گے،

من عمل بما علم ورثہ اللہ علم مالم یعلم	جو اپنے علم پر عمل کرے گا تو خدا تعالےٰ اسے ایسے علم کا وارث بنائیگا جسکو اب تک وہ نہیں جانتا تھا۔

پھر جس طرح یہ اعمال خیر اپنی تاثیرات سے خیر کی حقیقت قلوب تک پہونچا دیتے ہیں اسیطرح اعمال شر شر کی حقیقتیں قلب میں پیدا کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم نے خبر دی کہ بد اعمال لوگوں کے قلوب میں بد عملی کے سبب ایک زنگ بیٹھ جاتا ہے جو قبول حق کی استعداد کو آخر کار فنا کر دیتا ہے جسکو کہیں طبع سے کہیں رَین سے کہیں ختم سے کہیں وقر سے کہیں کنان سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

ایک جگہ فرمایا

کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔	ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

کہیں فرمایا۔

بل طبع اللہ علیھا بکفرھم۔	بلکہ خدا نے ان کے قلوب پر مُہر کر دی ان کے کافرانہ اعمال کے سبب۔

اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا

ایاکم والمحقرات من الذنوب فان الذنب علی الذنب یوقد علی صاحبہ جحیما ضخمۃ۔	چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بہت بچو کیونکہ گناہ پر گناہ کرتے رہنا اس گنہگار پر ایک عظیم الشان آگ روشن کر دیتا ہے

یعنی صغائر سے کبائر پر جرأت ہوتی ہے اور کبائر سے استخفاف معاصی اور کفر پر اور یہی آگ کا پیش خیمہ ہے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ۔

القلب کالکف فاذا اذنب الذنب انقبض واذا اذنب ذنبا اخرا نقبض ثم یطبع علیہ وھو الرین۔

قلب مثل کف دست کے کھلا ہوا ہے یعنی منشرح ہے جب گناہ کیا جاتا ہے تو سکڑ جاتا ہے پھر کیا جائے تو اور سکڑ جاتا ہے۔ یہانتک کہ بالآخر اُس پر مُہر کردی جاتی ہے اور یہی زنگ ہے۔ یعنی قبول حق کی استعداد بھی باقی نہیں رہتی"

اسی لئے حدیث ابی ہریرہؓ میں فرمایا گیا کہ۔

اذا اذنب الانسان حصلت فی قلبہ نکتۃ سوداء حتی یسود القلب۔

جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اُسکے قلب میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے اور جوں جوں وہ عمل بگڑتا رہتا ہے یہ ظلمانی نقطہ بھی بڑھتا جاتا ہے یہانتک کہ آخر کار قلب سیاہ پڑ جاتا ہے۔ گناہ کے دواعی قوی ہو جاتے ہیں اور توبہ کی توفیق مسلوب۔

بہر حال جس طرح پہلی نوع کی احادیث نے قلوب میں ایمانی کیفیات، ایمانی اخلاق راسخ ہونے کا سبب اعمال کو بتایا تھا۔ اسیطرح ان آیات و احادیث نے قلوب کے زنگ کفر اور بے توفیقی کا سبب بھی انسانی عمل اور کسب ہی کو بتایا ہے۔ اور ان دونوں قسم کے سلسلوں سے شریعت اسلام کا یہ دعویٰ بالکل پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے کہ ہر ظاہری عمل کا اثر قلب پر پڑتا ہے۔

مسئلہ تاثیر ظاہر دنیا کا عمومی مسئلہ ہے

پھر یہ ظاہر عمل کی تاثیر کا دعویٰ ایک اسلام ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ تمام مذاہب اُس کیساتھ اس دعویٰ میں متفق اللسان ہیں نہیں بلکہ تمام مذاہب کی تعمیریں ہی محض اس ایک اصول تاثیر ظاہر فی الباطن پر کھڑی ہوئی ہیں۔ کیونکہ تمام مذاہب کا مقصد رُوح کی ترقی ہے۔ اور یہ ترقی اعمال کے سوا ناممکن ہے کیونکہ محض احوال و کیفیات سے تو رُوح پہلے ہی سرشار تھی ہاں اسمیں اعمال کا وجود نہ تھا اس عمل کرنے اور اُن باطنی قوی کو بروئے کار لانے کے لئے ہی رُوح کو جسم کا

جامہ عطا ہوا تاکہ ان اعمال کے ذریعہ رُوح میں اُن اعمال کے مناسب ملکات راسخ اور متمکن ہو جائیں
اور ظاہر ہے کہ عمل کا تعلق جسم سے ہے نہ کہ رُوح سے۔

اسی لیے تمام مذاہب نے اپنا مقصد ترقی رُوح ظاہر کر کے جسقدر بھی اعمال اس مقصد کی تحصیل کے لیے بتلائے ان سب میں بجائے رُوح کے جسم کو مقید کیا گیا ہے۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ پھر معاشرۃ و تمدن کی تمام جزئیات اور سلسلۂ معاملات کے تمام ہی احکام جو کرنے اور نکرنے کے متعلق ہیں سب ہی اجسام پر جاری کیے گئے ہیں نہ کہ براہ راست رُوح پر۔

پس اگر اس ظاہر اجسام کی عملی قید و بند کو دیکھکر یہ کہدیا جائے کہ شرائع کا مقصد محض ان اعضاء جسم ہی کا پابند کرنا ہے اور بس یعنی رُوح اور ترقی رُوح سے ان شرائع کو کوئی بھی تعلق نہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ تزکیۂ رُوح اور ترقی باطن کو کہاں تلاش کیا جائے جبکہ مذاہب بھی اس مقصد سے خالی رہ گئے۔ اور اگر مذاہب کا اعلیٰ مقصد تزکیۂ رُوح یا ترقی باطن ہی تسلیم کر لیا جائے (جیسا واقعہ بھی یونہی ہے) تو سوال یہ ہے کہ پھر ان مذاہب نے اعمال کی قید و بند میں ان بیچارے اعضاء جسم کو کیوں مقید کر دیا؟۔

اس مشکل سوال کا حل اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم مذاہب کا مقصد ترقی رُوح اور اُسکی تحصیل کا ذریعہ اعمال بدن رکھکر بلا چون و چرا تسلیم کریں کہ جسم و رُوح میں ضرور کسی تاثیر و تأثر کا سلسلہ قائم ہے۔ اور یہ کہ ہمارے جسم کے حرکات و سکنات براہ راست رُوح پر اپنا اثر ڈالتے ہیں تاکہ اعمال شرائع کے ذریعہ روحانی ترقی بجائے خود باقی رہ سکے۔ ورنہ اگر اعمال کا اثر باطن پر تسلیم نہ کیا جائے تو تمام مذاہب کی تعمیریں بیک آن منہدم ہو جاتی ہیں اور انسان کا دنیا میں آنا اور آکر کچھ کرنا محض لغو اور بے سود اور عبث ٹھہر جاتا ہے۔

پس بجائے اس کے نکتہ چینیوں کے کسی بے جڑ وسوسہ سے تمام شرائع الٰہی کا انہدام جائز تصور کیا جائے۔ یہ زیادہ معقول ہے کہ اس وسوسہ ہی کو نامعقول اور مردود کہدیا جائے۔

پس اب اسلام بلکہ دنیا کے سارے ہی مذاہب کو اُن لایعقل افراد پر خندہ زنی کا موقع

ہے جو اپنی آزادئ رائے اور بے قیدی سے مغلوب ہو کر کہا کرتے ہیں کہ۔

"اگر ہم نے فلاں لباس پہن لیا یا فلاں کام کر لیا یا کچھ جزوی فرو گذاشتیں ظاہری طور پر کر لیں تو کیا ہمارے ایمان پر اثر پڑ جائیگا"؟ اُن سے خدا کا امر اور اس کا خلق یعنی حق تعالٰے کی تشریع اور اسکی تکوین منفعلانہ اقرار کرائیگی کہ ظواہر اعمال اور پیرایوں کا اثر باطن میں ایمانی آثار بھی پیدا کر سکتا ہے اور کفری بھی اور وہ ایمان کو بھی قلب سے محو کر سکتا ہے اور کفر کو بھی اور اس لئے ایسے خفیف الدماغ انسانوں کا یہ کہنا کہ ظاہر کا اثر باطن میں نہیں پہونچ سکتا خدا کے خلق و امر دونوں کی تکذیب اور مذہبی دنیا کی جمہوریت کا مقابلہ ہے۔

تاریخی شواہد سے مسئلہ کا اثبات

ان اُصولی اور علمی تصریحات کے بعد اگر تاریخ عالم کے واقعات و مشاہدات پر ایک نگاہ ڈال لیجائے تو ان ظواہر کی تاثیرات پر تاریخی واقعات بھی شہادت دیں گے۔ اور معلوم ہو گا کہ جب کبھی فرد یا قوم نے ظاہر عمل سے کسی خیر کا کسب کیا اگو خیر کی نیت بھی نہ ہو، تو آخر کار اس کے قلب میں خیر پہونچکر رہی۔ اور جب کسی نے اپنے عمل سے شر اور برائی کی صورت اختیار کی تو گو نیتہ شر کی نہ ہو تب بھی قلوب میں شر پیدا ہو کر رہی۔

(۱) پہلی فصول میں عمرو بن لحی بن قمعۃ ابن خندف کا ذکر آچکا ہے کہ اُس نے عمالقہ یمن کے بُت پرستوں کی مشابہت میں خود ہی بیت اللہ میں بُت نصب کئے اور گو اسوقت شرک کی نیت نہ تھی بلکہ شاید نظر کی یکسوئی اور دل کی یک رُخی کے لئے ان بتوں کا استقبال کیا گیا تھا لیکن بہرحال جبکہ یہ عمل ہی فی نفسہٖ شرک کا تھا تو انجام کار اہل عرب کے قلوب شرک اور بُت پرستی سے مملو ہو گئے اور عرب توحید اور ملتِ ابراہیم کے نور سے یکسر محروم کر دیا گیا۔ قالبوں نے جیسا شر کا عمل اختیار کیا قلوب نے بھی اُسی شر کے آثار قبول کر لئے۔

(۲) صاحب مرقاۃ شارح مشکوٰۃ لکھتے ہیں کہ گو سروری کا ایمان لانا بلا شبہ خدا کے حکم و مشیت سے متعلق ہے کہ ہدایت و ضلالت اُسی کے ید قدرۃ میں ہے۔ لیکن عالم اسباب میں جس

چیز نے ان کے قلوب میں استعداد پیدا کر دی وہ اُن کا ظاہری تشبہ تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے لباس سے انہوں نے کیا اور ویسا ہی جبہ و دستار پہنکر میدان مقابلہ میں آئے۔ گویا اپنے ظاہر کو تو انہوں نے پہلے ہی موسیٰ علیہ السلام کے تابع بنا لیا تھا اور ظاہراً و رسماً اُن میں اور موسیٰ علیہ السلام میں بُعد اور منافرت باقی نہ رہی تھی۔ آخر کار باطن بھی تابع ہو گیا اور قلبی منافرۃ بھی اُٹھ گئی جو ایمان کا ذریعہ بن گئی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ پر وہ کہہ سکتے تھے کہ موسیٰ بڑے ساحر ہیں اور ہم چھوٹے اسلئے اُن کا غلبہ دلیل صداقت نہیں بلکہ دلیل کمال فن ہی۔

(۳۳) پھر لکھتے ہیں کہ فرعون کے دربار کے ایک مسخرہ کو (جو موسیٰ علیہ السلام کی نقلیں اُتارا کرتا تھا اُن جیسا لباس پہنکر اُن جیسی عصا ہاتھ میں لیکر اُن کیسی آواز بنا کر فرعون اور فرعونیوں کو ہنسایا اور استھزاءً موسوی مقاصد کی تبلیغ کیا کرتا۔

جبکہ غرق سے اُسکو بچا لیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں شکوہ کیا کہ اُسے کیوں بچا لیا گیا۔ حالانکہ سب سے زیادہ ایذا مجھے اُسی کے تمسخر سے پہونچتی تھی۔ تو جواب دیا گیا کہ یہ بیشک تمسخر سے ایذا دیتا تھا اور اس کا قلب کفر ہی سے پُر بھی تھا لیکن تیری لباس جیسا لباس پہنتا تھا۔ تیری طرز تکلم جیسا طرز تکلم اختیار کرتا تھا اور تیری تمام اداؤں سے اس نے ظاہری مشابہت پیدا کر لی تھی پس ایک حبیب سے بعید تھا کہ دشمن کو حبیب کی زی ّ وہیئت میں عذاب دے۔ اسلئے اگر اس نے دنیا میں ظاہری طور پر تیری صورت سے تشبہ کیا تو صرف دنیا میں ظاہری طور پر ہی اُسے نجات بھی ملگئی کہ غرق بحر سے بچا لیا گیا۔ ہاں اس کا قلب کفر سے لبریز ہے۔ اسلئے اُسکی آخرۃ بھی عذاب سے لبریز ہے۔

(۴۴) اور اب اس اُمۃ میں بھی دیکھ لو کہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا ایمان بھی اسی ظاہری کی اثر اندازی کا رہین منت ہے۔ جنگ حُنین سے واپس آتا ہوا لشکر اسلامی راستہ میں کسی پڑاو پر فروکش تھا۔ گاؤں کے لڑکے عسکر اسلامی کو دیکھنے کیلئے تماشائی بنکر ہجوم کر آئے۔ جب لشکر میں اذان ہوئی تو تمام لڑکے استھزاء سے نقلیں اُتارنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان لڑکوں کو

پکڑ لاؤ۔ چنانچہ کچھ حاضر کئے گئے۔ پوچھا گیا کہ کون نقل اُتارتا تھا۔ سب نے ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کیطرف اشارہ کر دیا۔ اسلئے سب لڑکے رہا کر دیئے گئے اور ابو محذورہ کو اُن کی نیک نصیبی نے روک لیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کھڑے ہو۔ اور اذان کہو اور اذان کی نقل اُتارو۔ یہ کھڑے ہوئے اور جیسے آپ اذان تلقین فرماتے گئے وہ بتکلف اور بجبر زبان سے ادا کرتے رہے۔ یہانتک کہ اُسی زبان سے توحید و رسالت کی وہ شہادت بھی ادا کی جس کیوجہ سے تمام عرب میں ایک تلاطم بپا تھا۔ لیکن سبحان اللہ کہ اس ظاہری حرکت لسانی نے ابو محذورہ کے قلب کو محروم نہ چھوڑا، بلکہ وہی توحید و رسالت کی شہادۃ جو زبان سے بتکلف ادا کرائی گئی بالآخر سویدا قلب میں پہنچکر رہی۔ اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ ابو محذورہ کس جلالت کے آسمان کا ایک درخشندہ ستارہ ہیں۔

اور اسی حدیث سے بداہتہً یہ بھی نکل آیا کہ نبوۃ کے آثار لطیفہ اگر قلوب میں پہنچ سکتے ہیں تو زبانوں کی شہادۃ اور ظاہر کے متأثر کرنے ہی سے پہنچ سکتے ہیں کیونکہ کسی باطن میں جب ایسی چیز پہنچائی جائیگی جو اُس میں نہیں ہے تو اُس کا راستہ یہی ہے کہ ظاہر کے راستہ سے اُسے قبول کیا جائے قلوب کے عالم کا ظاہر لسان اور جوارح ہی ہیں تو جو بھی آثار ظاہر پر ڈال لئے جاویں گے وہی آثار باطن کو بھی متأثر کر دیں گے۔

چوں بیاری طہارت ظاہر		باطنت نیز حق کند طاہر

اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا۔

اسلم ولو کنت کارھًا۔ | اسلام لے آؤ اگرچہ ابتداءً اس سے کراہت بھی ہو۔

کیونکہ انجام کار یہ ظاہری اسلام ہی باطن کو رنگ دیتا ہے۔

ہمہ ذلت و ہمہ دنیا و ہمہ نام   اللہ اللہ کردہ باید والسلام

اسی اصول پر حدیث میں خشوع و خضوع حاصل کرنے اور حق تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کا داعیہ پیدا کرنے کی ترکیب بتلائی گئی کہ۔

فان لم تبکوا فتباکوا۔ | اگر تم رونہ سکو تو رونے کی صورت ہی بنالو جس میں بتکلف رونے کی صورت بنا لینے سے گریہ کی حقیقت

قلب میں پیدا ہو جائے گی۔

اور ٹھیک اسی اُصول کو کہ ہر ظاہر اپنے باطن میں مؤثر ہے۔ ابوداؤد کی اس حدیث میں جسکو مردود ٹھہرانے میں نکتہ چینوں نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر دیا ہے ان کھلے الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے۔

من تشبہ بقوم فھو منھم ۔	جو کسی قوم سے ظاہری مشابہت پیدا کرے گا وہ انجام کار باطناً بھی اسی قوم میں سے ہو جائیگا۔

بہر حال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جب کبھی اسلام (ظاہر عمل) پر حملہ کیا جائیگا تو نہیں ہو سکتا کہ ایمان (باطنی حقیقت) اس سے متاثر نہ ہو اگر اسلامی اعمال کے پیرائے چھوڑ دئے جائیں تو بلاشبہ ان متروک پیرایوں کی حقیقتیں بھی نہ رہینگی اور دین کے اعضاء یک قلم قلم کر دینے کے بعد اُس کی ایمانی رُوح بھی خود بخود سمٹ جائے گی۔

پس یہ وسوسہ محض ایک نفسانی دھوکہ یا شیطانی نزغہ ہے کہ ظاہری اوضاع باطن پر مؤثر نہیں ہیں۔ جس کیلئے نہ کوئی شرعی حجت ہے نہ عقلی برہان۔

پس نکتہ چینوں کا یہ کہنا کہ حدیث من تشبہ بقوم روایۃً ودرایۃً مردود ہے خود ہی عقلاً اور نقلاً مردود اور ناقابل التفات ہے۔ اُنھوں نے جو رد وطرد حدیث پر ڈالنا چاہا وہ الحمد للہ کہ انہیں کی طرف لوٹ گیا۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔

ظاہری اعمال باطنی جذبات کے ترجمان ہیں

(۱۳) بحمد اللہ یہاں تک دلائل و نظائر سے ثابت ہو چکا ہے کہ تشبہ کے یہ ظاہری اعمال اپنی تاثیر سے باطن تک پہنچ جاتے اور قلب میں متشبہانہ انقلاب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر اور زیادہ غائر نظر سے کام لیا جائے تو یہ نظر آئیگا کہ قلوب فی الحقیقت اس عملی تشبہ کی تاثیرات سے انقلاب قبول نہیں کرتے۔ بلکہ قلوب کے پیشگی انقلاب کی وجہ سے اس عملی تشبہ کا جوارح پر ظہور ہوتا ہے۔ گو پھر یہی عملی تشبہ قلوب میں اس انقلاب و تبدیل کو قائم اور راسخ بھی بنا دیتا ہے۔ پس عملی

تشبہ تو صرف قلوب کے اُلٹ جانے کی ایک دلیل ہے جس سے قلبی انقلاب کا ثبوت ملجاتا ہی جو ایک ثانوی مرتبہ ہے۔ ورنہ قلوب ان اعمال کی اثراندازی سے پیشتر ہی تشبہ کا انقلاب قبول کر چکتے ہیں۔

کیونکہ ان اعمال کا قلب تک آثار پہونچانا اسپر موقوف ہو کہ وہ جوارح سے سرزد تو ہو جائیں اور کسی عمل کا جوارح سے سرزد ہونا اسکے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے قلب میں اس کا منشا موجود ہو اس کیطرف قلب کو رکون و میلان پیدا ہو اور پھر عزم و تہیہ کے ساتھہ قلب تعمیل کے لئے تیار ہو جائے۔ یعنی ہر عمل کی تقویم پہلے باطن سے ہوتی ہو اور پھر ظاہر کا آئینہ اسکو چمکا کر سب کے سامنے کر دیتا ہو۔ گویا ہر ایک عملی پیرایہ اپنی حقیقت کا عکس ہوتا اور ہر ایک ظاہر اپنے باطن کا راز فاش کر دیتا ہے۔

پس جس طرح ایک درخت کا تمام ظاہری پھیلاؤ پہلے اپنی چھپی ہوئی جڑ سے ظہور پذیر ہوتا ہی اور پھر جوں جوں اس کی شاخیں ہوا میں پھیلتی جاتی ہیں ٗووں ٗووں جڑ کے ریشے تعرزمین میں پھیلتے اور استحکام حاصل کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک متشبہ کی ظاہری مشابہتیں پہلے اپنی باطنی جڑ (میلان و دواعی قلب) سے آشکارا ہوتی ہیں اور پھر جوں جوں تشبہ کے شعبے جوارح پر چھاتے رہتے ہیں ٗووں ٗووں قلب میں دواعی تشبہ کا رسوخ بڑھتا جاتا ہی۔ تاآنکہ ایک دن متشبہ کی تمامتر ترقی اور منتہائے مقاصد ہی تشبہ بنجاتا ہی۔

پس ایک متشبہ تو اسی دھوکہ میں گرفتار ہو کہ اس سے اس ظاہری تشبہ بالاغیار کے قبیح آثار یا ظاہر ہی تک محدود ہیں یا مستقبل میں شاید قلب کو بدلڈالیں گویا اوقات عمل میں قلب تشبہ سے بری ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کا یہ ظاہری تشبہ بالکفار ابتدا ہی سے اسکے قبیح باطن اور قلبی تشبہ کا ایک ظل اور اثر ہی جو قلب کے دواعی تشبہ سے لبریز ہو چکنے کے بعد نمایاں ہوا ہی اور قلبی تشبہ کی دلیل ہی اس ظاہری تشبہ نے قلب میں تشبہ کی تخم ریزی نہیں کی بلکہ قدیم تخم ریزی (جو پہلے ہی مناسبات باطن کے سبب قلب میں ہو چکی تھی) اسکے ثمرات کو جوارح پر نمایاں کر دیا۔ پس کسی ناسمجھہ متشبہ کا ان ظاہری برائیوں کے ہوتے ہوئے باطن کو درست گمان کرنا محض ایک طفلانہ توہم ہی۔ اُسے یقین کر لینا چاہیئے کہ سوء ظاہر سوء باطن کی دلیل ہو نہ کہ حسن باطن کی۔ ایسے ناسمجھہ انسانوں کو محسوسات

نکے اس محسوس ومشاہد مسئلہ پر بھی ایک نگاہ اعتبار ڈال لینی چاہیئے کہ ایک مریض جس کے چہرہ پر مُردنی چھائی ہو آنکھوں میں حلقے پڑگئے ہوں اور جسم زرد پڑ چکا ہو تو کیا یہ اسکی مرضیلی صورت اندرونی صحتہ کی دلیل ہے یا مرض کی؟ ظاہر ہے کہ ایسا نحیف وناتواں پیرایہ تو نقاہت باطن ہی کی دلیل بن سکتا ہے نہ کہ صحتہ و قوۃ باطن کی۔

ٹھیک اسیطرح جن بدقسمتوں کے اجسام روحانی امراض کی نقاہت کو نمایاں کر رہے ہوں جنکے چہرے مُہرے۔ ہاتھ پیر۔ جنکے ملابس و مطاعم لامذہبی ودہریۃ۔ زندقہ والحاد اور دین قیمہ کیساتھ شوخی وشوخ چشمی کو عیاں کر رہی ہوں کیا یہ اسکی دلیل ہوگی کہ ان کا قلب مذہب ودین اور خشیۃ الٰہی سے لبریز ہے۔ وہ سچے خدا پرست اور ارباب زہد وصلاح میں سے ہیں۔ اور اس تاریکی ظاہر کے ہوتے ہوئے بھی ان کا باطن روحانیت کی صحتہ سے تازہ اور سرشار ہے؟ کبھی نہیں۔ کیونکہ روحانی صحتہ یعنی مذہبی حقیقت اپنی ہی صورت میں آسکتی ہے اور لامذہبی اپنی ہی صورت پر۔ اگر ارباب ورع وتقویٰ ظہور کریں گے تو اپنی ہی متقیانہ شکل پر اور اگر ارباب وحل ودہریۃ کا خروج ہوگا تو اپنی کی دہریانہ صورت پر۔

اسی حقیقت کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ

وفی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہٗ واذا فسدت فسد الجسد کلہٗ الا وھی القلب	انسان کے بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہے تو سارا بدن درست ہے اور اگر اس میں فساد آجائے

تو سارا بدن فاسد ہو جائے۔ مسئلہ وہی لوتھڑا قلب ہے۔ یعنی ظاہر کا صلاح وفساد باطن کے تابع ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اسی حقیقت کو اسطرح واضح فرمایا گیا کہ۔

انما الاعمال کالوعاء اذا طاب اسفلہ طاب اعلاہ واذا فسد اسفلہ فسد اعلاہ =	اعمال مثل برتن کے ہیں جبکہ ان میں کی چیز کا نیچے کا حصہ اچھا ہے تو اوپر کا بھی اچھا ہوگا اور جب تلی کا حصہ خراب خراب ہے تو اوپر کا حصہ بھی خراب ہوگا۔

پس قلب وقالب ایک حقیقت کے دو رُخ اور ایک شے کو دو سرے ہیں جو ظاہر وباطن یا رُوح وجسد یا

قلب و قالب کے نام سے موسوم کر دئے گئے ہیں اور جبکہ ان میں سے باطن یا روح کا وجود مقدم ہے تو ظاہر پر کوئی حرکت و نمو ایسی نہیں آسکتی جو پہلے باطن سے نہ اٹھی ہو۔

پس ان سادہ لوحوں کو اپنے توہمات و خیالات پر نظر ثانی کرنی چاہئے جو بے دھڑک کہہ دیا کرتے یا قلم ہاتھ میں اٹھا کر لکھ مارتے ہیں کہ اگر ہم نے تشبہ بالاقوام کر کے لباس بدل دیا یا صورتیں مسخ کرلیں تو کیا ان جزئی امور سے ہمارے ایمان میں تغیر آجائیگا؟ نہیں کیا معلوم ہے کہ تغیر آئیگا نہیں بلکہ پہلے سے آچکا تھا اور اسی لئے ہمارے تغیر ہی کے یہ سب مظاہر ہو رہے ہیں۔ جو صورتوں اور لباسوں پر چھا گئے ہیں اگر قلب اس تشبہ بالکفار کی نحوست سے پاک ہوتا تو ظاہر کی تراش کیوں اس طرح مسخ ہو جاتی۔

لیکن دیکھنے والی آنکھ ہی نہیں کہ دیکھے اور آنکھ کب دیکھ سکتی ہے جبکہ قلوب ہی میں بینائی نہ رہی

فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔	بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔

اعاذنا اللہ من سوء البصارۃ والبصیرۃ۔

الحمد للہ کہ اس سلسلہ کلام میں نکتہ چینوں کے اس دعوی کی کہ "ظاہری اوضاع باطن میں اثر نہیں ڈالتیں" پوری قلعی کھل گئی۔ اور یہ بات دلائل سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ دعوی غافل قلوب یا حیلہ جو طبائع کا ایک وہم ہے۔ اگر بالفرض ظاہر کا اثر باطن پر نہیں بھی پڑتا تو کم از کم ظاہر ہی بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ خود ایک عیب ہے اور اگر باطن پر اثر پڑتا ہے تو پھر دوہرا عیب ہے۔ اور پھر پہلی بات تو یہ ہے کہ باطن درحقیقت ظاہر کی بگڑ سے پیشتر ہی بگڑ چکا ہے ظاہر بگاڑ کر باطن کے بگاڑ کا انتظار کرنا محض ایک دھوکہ ہی ہے۔

اسلئے ان دوہرا عیب تک پہونچنے کی نوبت ہی بعد میں آسکتی ہے پہلے ان تاثیرات تک تو قلم اٹھا کر بیٹھنا خدا و حکیم کے امر کی تکذیب کرنا ہے اور اسکے خلق کو بھی بگاڑنا مثل القوم الذین کذبوا بآیات اللہ واللہ لا یہدی القوم الظالمین۔

۳

ثلثہ چینوں سے اس شبہہ کا تیسرا رکن یہ ہو کہ کسی ما مور و منہی کی عام جزئیات قابل التفات نہیں ہوتیں بلکہ ما مور و منہی کا فی الجملہ امتثال کافی ہے۔ جو کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینے سے بھی ہو سکتا ہو پس جبکہ ترک تشبّہ یا مخالفۃ کفّار ایک ایسا ہی منہی عنہ ہے جو بہت سے افراد پر مشتمل ہو تو وہ بھی اپنی کسی ایک آدھ جزئی کے زیر عمل آجانے سے ادا ہو جانا چاہیے یعنی اگر ہم بلا تعیین کسی نہ کسی جزئی میں بھی کفار کی مخالفت کر لیں اور ان سے تشبّہ منقطع کر دیں تو ترک تشبّہ کا حق ادا ہو جائیگا۔ اور ہم نہی الٰہی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائیں گے۔ کوئی ضرورت نہیں ہو کہ ترک تشبّہ کی ہر ہر جزئی کا خواہ مخواہ اُمّت کو پابند بنایا جائے۔

جواب

اول تو ہمارے نزدیک یہ شبہہ کوئی ایسا معتدبہ شبہہ ہی نہیں جس کی بنا کسی صحیح مقدمہ پر ہو یا اسکی کوئی محصّل حقیقت قائم ہوتی ہو کہ اس کے جواب کے لئے قلم اٹھایا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مدعی پورے دین کو ضروری اور واجب الاعتبار ماننے کا دعوےٰ رکھتے ہیں (اور ضرور رکھتے ہیں جیسا کہ تہذیب الاخلاق میں اسلام اسلام پکارنے اور اپنے کو مسلم ظاہر کرنے سے ہویدا ہے) تو پھر دین کے کسی جزو کو علانیہ غیر ضروری ٹھہرا دینے کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر اُن کے نزدیک فی الحقیقت دین کا کوئی ادنیٰ جزئیہ بھی غیر ضروری یا ساقط الاعتبار ہو۔ تو پھر ان کا مجموعہ دین کو ضروری اور واجب الاعتبار کہنا کس حد تک قابل تسلیم ہوگا؟۔

یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بد فہم انسان پورے انسانی بدن کو تو حکیمانہ صنعت بتلائے لیکن ناخن یا بدن کے رونگٹیں یا اور کسی عضو کو غیر ضروری اور ناموزوں بھی کہے۔ پس اگر یہ ان بعض اعضاء کو غیر حکیمانہ بتلانے میں سچ بول رہا ہے تو یقیناً کل بدن کو حکیمانہ صنعت کہنے میں جھوٹ بول رہا ہے اور اگر کل کے بارے میں سچا ہو تو بلاشبہ اس جزئی دعوی میں جھوٹا ہو۔

اسیطرح یہ فہم و فراست کے دعویدار جبکہ مجموعی اسلام کو تو اپنی زبان سے حکیمانہ امر کہیں لیکن اسلام کے اس اہم جزو ترک تشبہ یا مخالفۃ کفار کے عام شعبوں کا انکار کرنے لگیں تو ضرور ہے کہ وہ بھی اس اقرار و انکار میں سے کسی ایک میں دروغ گو اور کذاب ہوں۔ پس جبکہ ان کے شبہ کے مقدمات ہی باہمی تناقض کیوجہ سے امکان کی سطح پر نہیں آتے تو شبہہ کی حقیقت ہی قائم نہ ہوئی کہ ہم جواب کیطرف التفات کریں۔

لیکن اگر مان لیا جائے کہ یہ شبہہ کوئی اہم اور حل طلب نقص ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ یہ مجموعی حیثیت سے مخالفۃ کفار یا ترک تشبہ کے غیر ضروری ہونے کا دعویٰ آیا۔ آپ عملاً کر رہے ہیں یا اعتقاداً اگر آپ محض عملاً ہی اسکو غیر ضروری سمجھتے ہیں کہ کفار سے لباس و معاشرۃ وغیرہ میں کلیۃً مشابہت قطع کیجائے۔ کافی ہے کہ کسی ایک آدھ جزو میں کوئی جزوی امتیاز پیدا کر لیا جائے جیسے کوٹ پتلون اور دوسری مخصوص اوضاع نصرانیت اختیار کر کے صرف ٹوپی اسلامی پہن لیجائے۔ تو میں کہتا ہوں کہ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ سارا لباس زنانہ پہنکر اوپر سے ایک مردانہ ٹوپی فی الجملہ امتیاز قائم کرنے کے لئے پہن لیں۔ اور اس حلیہ سے کسی مہذب سوسائٹی میں بے تکلف چلے جائیں۔ نہ آپ کو کسی عار کی پروا ہو نہ ملامت کی۔ اگر آپ عرف عام کے خلاف ایسا کر سکتے ہیں تو ممکن ہی کہ عرف شریعت کے خلاف بھی آپ کے اس فی الجملہ امتیاز پر تحمل کیا جا سکے لیکن جبکہ آپکو تو جنس یا اپنی برابر کی مخلوق سے عار آتا ہے تو کیا غضب ہے کہ یہاں آپ کو خالق سے کوئی عار نہ آئے۔ پھر اگر عورتوں سے تشبہ کرنے والوں اور فی الجملہ امتیاز کو کافی سمجھنے والوں پر آپ ملامت کرنے کو ذرا بھی برا نہیں سمجھتے۔ تو پھر تشبہ بالکفار کرتے وقت جبکہ یہی فی الجملہ امتیاز کا بھوت تم پر سوار ہو اپنے اوپر ملامت کرنے کو کیوں برا سمجھتے ہو؟۔

اور اگر آپ کفار کی کلی مخالفت اور تشبہ بالکفار کے کلیۃً ترک کرنے کو اعتقاداً بھی غیر ضروری جانتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ آیا آپنے کسی تاویل سے ایسا اعتقاد پیدا کیا یا بلا تاویل۔ اگر بلا تاویل آپ دین کے کسی شعبہ کو جو بلا شبہہ دین ہے غیر ضروری اور ساقط الاعتبار کہہ رہے ہیں۔ تو پھر

آپ کو اپنی عاقبت کی فکر کرلینی چاہیئے کہ یہ تو اللہ اور اس کے رسول پر کھلے بندوں افترا باندھنا اور اس کے دین کے ایک حصہ کی صریح تکذیب کرنا ہے۔

فمن اظلم ممن کذب علی اللہ وکذب بالصدق اذجاءہ الیس فی جہنم مثوی للکافرین۔	سو اس شخص سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور سچی بات کو جبکہ وہ اس کے پاس پہونچے جھٹلا دے کیا جہنم میں ایسے کافروں کا ٹھکانا نہو گا؟۔

اور پھر نہ صرف یہ دین کے کسی ایک حصہ ہی کی تکذیب ہے بلکہ پورے ہی دین کو جھوٹا ٹھیرانا اور بے اعتبار بنانا ہے اور بلکہ اپنی رائے سے سارے دین کو منسوخ کر دینا ہے۔

کیونکہ جب آپ کے نزدیک ترک تشبہ کے ذریعہ کفار کی مخالفۃ کلیۃً ضروری نہیں۔ کسی ایک آدھ جزئی میں کافی ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس ایک آدھ جزئی کے علاوہ تمام اُمور میں کفار کی موافقت جائز ہے۔ اور جبکہ موافقۃ کفار جائز ہے۔ تو بلاشبہ آپ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی مخالفۃ بھی جائز ہے۔ کیونکہ موافقۃ کفار بعینہٖ مخالفۃ انبیاء ہے۔ ورنہ اگر موافقۃ کفار مخالفۃ انبیاء نہو بلکہ عین موافقۃ انبیاء ہو تو انبیاء علیہم السلام اور کفار کے مقاصد کا واحد ہونا اور اسلام و کفر کا ایک ہوجانا لازم آئیگا۔ اسلئے لامحالہ موافقۃ کفار کو بعینہٖ مخالفۃ انبیاء ماننا پڑیگا۔

پس آپ سوچ لیں کہ اس زعم کے ہوتے ہوئے دین کس طرح باقی رہ سکتا ہے اور ہے تو ضروری کس طرح رہ سکتا ہے۔ کیونکہ دین میں ایک حصہ مامورات کا ہے جسمیں سنن انبیاء کے ساتھ تسنن کرنا سکھلایا گیا ہے۔ جس کو تحلیہ کہنا چاہیئے اور ایک حصہ منہیات کا ہے جسمیں سنن کفار سے احتراز کرنا بتلایا گیا ہے جسکو تخلیہ کہنا چاہیئے اور جبکہ ان گستاخوں کے نزدیک نہ تشبہ بالانبیاء ضروری نہ ترک تشبہ بالکفار ضروری نہ تحلی بالفضائل ضروری نہ تخلی عن الرذائل ضروری۔ پھر اس میں کیا شبہ ہے کہ ان کے نزدیک مجموعہ دین ہی غیر ضروری ہے۔

اور پھر کوئی ان قومی ریفارمروں سے پوچھے کہ معاذ اللہ ایسے غیر ضروری اسلام کو جس کی ضرورۃ عدم ضرورۃ کے مساوی ہو اور جس کے محرمات اس کے جائزات کے ہمرتبہ ہوں۔ گویا

جس میں نہ حلّت کا پتہ ہو نہ حرمت کا۔ نہ اسمیں کوئی کبیرہ واجب الترک ہو اور نہ کوئی فریضہ واجب العمل دنیا میں آنے اور تحدی کے ساتھ غیر مذاہب کو ھل من مبارز کہنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کیا غیر ضروری اور مساوی الفعل والترک امور پر بھی دنیا میں کبھی تحدی کیگئی اور چیلنج دئے گئے ہیں ؟

اور پھر یہ مدعی جواب دیں کہ آخر بسیط ارض پر وہ کونسا اسلام ہے جس کی جامعیت کی دھوم تھی اور جس کے تمام وکمال کا اغیار میں بھی چرچا تھا ۔؟ اگر وہ یہی اسلام ہے جسکی عدم ضرورت کی تصویر تہذیب الاخلاق کے صفحات میں کھینچی گئی ہو ۔ تو حیرت ہے کہ خدا کا آخری دین اور اتنا غیر ضروری غیر مکمل اور نا تمام ہو کہ نہ اسمیں کوئی چیز صبر کرنے کی ہو نہ چھوڑنے کی ۔ اور اگر وہ کہیں اور ہے جو تہذیب الاخلاق کے مؤلف کو ابتک دستیاب نہیں ہو سکا تھا تو بجائے اس کے کہ خواہ مخواہ اس بلا تاویل اعتقاد کے ادعا سے مسلمانوں کو دھوکہ میں ڈالتے مناسب تھا کہ اس صحیح اسلام کی تلاش میں لگتے ۔

کیا ان مدعیان شعور کو دین میں اتنا بھی شعور نصیب نہو سکا کہ عام جزئیات دین کو اس طرح ناقابل التفات ٹھیرا دینے اور عمل کے ہر ممنوع و محرم حصہ کے متعلق لا بأس و لا حرج کہدینے میں اس کے سوا اور کیا نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے کہ امت ارتکاب کبائر اور ترک فرائض پر جری ہو ایک ایک کرکے اس سے اسلامی شعبے رخصت ہو جائیں ۔ اسلامی خصائص مٹ جائیں اور غیر اسلامی شعائر بادلوں کی طرح امت پر چھا جائیں جیسا کہ یونہی واقعہ وقوع پذیر ہو بھی رہا ہے ۔

پھر کوئی ان مدعیان دانش و بینش سے پوچھے کہ آیا انہوں نے قوم کیلئے یہ کوئی اچھی اور مفید تجویز کی یا مسئلہ تشبہ کا رد کرتے ہوئے امت کو ایک ایسے ضلالت انگیز اور سفاہت آمیز راستہ پر ڈالدیا کہ ان کے قلوب پر اتباع ہدیٰ اور خیر کے دروازے تو بند ہو جائیں اور اتباع ہویٰ اور شر کی راہیں کھل جائیں ۔ ہر شخص اپنے قول و عمل میں بے قید اور مطلق العنان ہو ۔ ہر معصیت زیر لا بأس و لا حرج ہو اور اسطرح دنیا معاصی کا ایک جہنم بنجائے ۔

کسقدر عبرت کی جگہ ہے کہ امت کے اسلاف اور فقہا نے تو حرمات حدود اور تحفظ اصول کی خاطر

مشتبہات بلکہ کتنے ہی مباحات سے بھی اُمّت کو بطور سدِّ ذرائع باز رکھنے کی سعی کی۔ تا آنکہ آج دین اپنی اصلی صورت میں اخلاف تک پہنچ گیا لیکن ان مدعیانِ تفقہ نے اپنی اہواء کی خاطر پہلے اس کے اُصول و حرمات ہی پر ہاتھ صاف کیا۔ تا آنکہ اپنے اور کتنوں ہی کے قلوب سے وہ اسلاف کی جمع کردہ پونجی نہایت سہولت سے کھو بیٹھے اور راہِ استقامت سے ہٹ گئے۔ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔

بہرحال اگر ان نکتہ چینوں نے مخالفۃ کفار کے کلیۃً غیر ضروری ہونے کا اعتقاد بلا تاویل ہی دل میں جمایا تو انہوں نے نہ صرف مخالفۃ کفار ہی کو غیر ضروری کہا بلکہ موافقۃ انبیاء کو بھی غیر ضروری کہنے کے مجرم ہوگئے اور اس ناقابلِ تلافی جرم کی عاقبت و عقوبت وہ خود سوچ لیں۔

ہاں اگر انہوں نے مخالفۃ کفار اور موافقۃ انبیاء کے کلیۃً غیر ضروری ہونے کا اعتقاد کسی تاویل سے جمایا جس کی تقریر مثلاً یوں کیجائے کہ یہ مخالفۃ و موافقۃ جبکہ امر و نہی کے ذریعہ طلب کیگئی تو موافقۃ انبیاء کا امر اطیعوا الرسول (رسول کی اطاعت کرو) اور یہ مخالفۃ کفار کی نہی لا تتبعوا یا لا تتشبھوا بالکفار (کفار سے مشابہت مت کرو یا ان کا اتباع مت کرو) فعل ہونے کی حیثیت سے ایک مطلق ہے جس کے ذریعہ علی الاطلاق ہم سے موافقۃ انبیاء اور مخالفۃ کفار طلب کیگئی ہے۔ اور مطلق کے متعلق اُصول میں طے پاچکا ہے کہ وہ اپنی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزئی پر بھی عمل ہوجانے سے ادا ہوجاتا ہے تو ہم اگر کسی ایک آدھ جزئی میں بھی انبیاء علیہم السلام کی موافقت کرلیں اور باقی امور میں خلاف رہیں یا اسیطرح کسی ایک آدھ جزئی میں کفار کا خلاف کرلیں اور باقی تمام اُمور میں اُنکے موافق رہیں تو ہم بھی اس امرِ اتباع اور نہی تشبّہ کا حق ادا کردینگے۔ کیا ضرورت ہے کہ ایک ایک جزئی میں انبیاء علیہم السلام کی کلی موافقت اور کفار کی کلی مخالفۃ ضروری ٹھیرادیجائے۔

تو ہم اس عجیب و غریب تاویل کو سامنے رکھکر جس سے سوال کی زیغ قلب اتباع متشابہ اور ابتغاء فتنہ کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے کہتے ہیں کہ نہ ان سوالوں نے حقیقۃ مطلقہ کی حقیقۃ کو سمجھا اور نہ اسکے متفاوت اسالیب استعمال ہی پر مطلع ہوسکے۔ انہوں نے ناسمجھی سے یہ تو دعویٰ کردیا کہ اتباع انبیاء جو امور بہ ہے اور اتباع کفار جو منہی عنہ ہے فعل ہونے کی حیثیۃ سے ایک حقیقۃ مطلقہ ہی

ہے جس میں عموم کا دخل نہیں۔ اور اس اصول پر اگر اس اتباع انبیاء اور ترک اتباع کفار کا کوئی ادنیٰ سا جزو بھی ادا کر دیا جائے۔ تو یہ حقیقۃ مطلقہ ادا ہو جانی چاہیے اور مخاطبوں کو امر و نہی کی ذمہ داریوں سے ہلکا بھی ہو جانا چاہیے۔

لیکن ان لاعلم نکتہ چینوں کو اسکی کیا خبر ہے کہ کبھی کبھی مطلق کی حقیقت پر دوسرے قواعد فقہیہ غالب آکر اُسے اپنی ماہیت سے نکال دیتے ہیں۔ وہ مطلق ہونے کے بجائے عام بنجاتا اور اسکی حقیقۃ مطلقہ حقیقۃ عامہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب کوئی مطلق یا نکرہ نفی کے تحت میں آجائے تو پھر اس کا اطلاق فنا ہو کر عموم کیلئے جگہ خالی کر دیتا ہے اور اسکے افراد کو اطلاق کے بجائے استغراق گھیر لیتا ہے۔

پس سابق اطلاق میں اگر کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینا کفایت کرتا تھا اور مطلق کی حقیقۃ ادا ہو جاتی تھی تو عموم و استغراق میں اس کا ہر ہر فرد ضروری العمل ہو جاتا اور کسی ایک آدھ فرد پر عمل کر لینا عموم کی ادا حقیقت کے لئے ناکافی ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کو امر کیا جائے کہ۔

وافق احدًا من المسلمین = تم مسلمانوں میں سے کسی کے ساتھ موافقت کرو۔

تو یہ نکرہ (احدًا) ابھی تک اپنے اطلاق پر ہے۔ اگر مامور نے مسلمانوں کے کسی ایک فرد واحد کیساتھ بھی موافقت کر لی۔ تو بلا شبہ اس نے امر کا حق ادا کر دیا۔ ضروری نہیں ہے کہ اس حقیقۃ مطلقہ کی ادائیگی کے لئے سارے ہی افراد مسلمین کیساتھ موافقت ضروری سمجھی جائے۔ لیکن اگر اسی موافقت کی نفی کی جائے اور اسکو زیر نہی لاکر اسطرح ادا کیا جائے کہ۔

لاتوافق احدا من الکفار = کفار میں سے کسی سے موافقت کرو۔

تو اب یہ نکرہ منفیہ بجائے مطلق ہونے کے عام بن گیا جس کے ہر ہر فرد کو زیر نفی لانا ضروری ہو گیا پس اگر مامور نے ہر ہر فرد سے اپنی موافقت قطع کر لی۔ تب تو اس نے نہی کا حق ادا کیا اور اگر کفار کے کسی ایک فرد سے بھی موافقت باقی رہگئی تو نہی کی تعمیل سے ضرور قاصر سمجھا جائیگا۔

ٹھیک اسیطرح جبکہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تشبہ بالکفار یا اتباع و موافقۃ کفار سے نہی کی

اور فرمایا کہ۔

لاتتبعوا اھواء قوم قد ضلوا۔	گمراہوں کی خواہشات کی پیروی مت کرو۔
لاتتبعوا السبل۔	کج راستوں پر مت چلو۔
لاتتبع سبیل المفسدین۔	مفسدوں کی راہ مت اختیار کرو۔
لاتکونوا کالذین اذوا موسیٰ۔	موسیٰ علیہ السلام کے ایذا دہندوں کی مانند مت ہو۔
لاتکونوا کالذین کفروا۔	کافروں کی مانند مت ہو۔

یا حدیث نے نہی کی کہ۔

لاتتشبھوا بالاعاجم لیس منا من تشبہ	عجمیوں کی ساتھ تشبہ مت کرو۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے
بقوم غیرنا۔	جو ہمارے اغیار سے تشبہ کرے۔

یا کہیں اسی منفی حقیقت کو بصورت اثبات ادا فرمایا کہ۔

خالفوا اھل البوادی۔	خلاف کرو جنگلیوں کا۔
خالفوا الاعراب۔	خلاف کرو گنواروں کا۔
خالفوا الاعاجم۔	خلاف کرو عجمیوں کا۔
خالفوا المشرکین۔	خلاف کرو مشرکوں کا۔

تو اسی مذکورہ اصول کے موافق جبکہ خلاف کفار اور مخالفۃ مشرکین یا اتباع اہل ہوی کی حقیقت مطلقہ زیر نہی آئی تو عام بن گئی اور اسوقت تک ادا شدہ نہ سمجھی جائے گی۔ جب تک کہ اس اتباع کفار یا تشبہ بالاقوام کے ایک ایک جزئی سے احتراز ضروری نہ سمجھا جائے۔

پس اب بھی مخالفۃ کفار کو حقیقۃ مطلقہ کہکر کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر لینے سے اُسے ادا شدہ ماننا نہایت ہی بے خبری اور غفلت پر مبنی ہوگا۔

ہاں سوال یہ باقی رہا کہ اس منہی عنہ موافقۃ کفار کو تو نفی نے عام بنا دیا اس لیئے اس کا ہر ہر فرد ضروری العمل بنگیا۔ لیکن موافقۃ انبیاء تو مامور بہ اور مثبت ہونے کی وجہ سے اپنے اطلاق

اس کے تمام اجزا کا اتباع بھی مطلوب ہے۔ ورنہ کل کے مطلوب ہونے اور اسکے کل اجزا کے مطلوب نہ ہوسکنے کے کوئی معنی نہیں۔ پس اس اسلوب پر اتباع انبیا کا عموم و شمول اور استغراق اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا اور اطلاق محض باطل ٹھہر جاتا ہے۔

بہر حال جبکہ موافقۃ انبیا اور مخالفۃ کفار کی حقیقتیں اپنے اندر کوئی ایسا اطلاق نہیں رکھتیں جو نکتہ چینیوں کی قلۃ مبالاۃ اور عملی توانی میں مدد دے سکے۔ بلکہ ایسا عموم رکھتی ہیں جو اپنے سارے ہی افراد پر حاوی و شامل ہے۔ تو اب یہ مخالفۃ و موافقۃ اپنے اجزا یا افراد کے لحاظ سے ایک کل اور مجموعہ کی حیثیت میں آگئیں۔ اور ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی حسی و معنوی مجموعہ بغیر اپنے سارے اجزا کی فراہمی کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک ایک کر کے اسکے اجزا محو کر دئے جائیں۔ اور باقیماندہ اجزا پر قناعت کر لیجائے تو یہی (ابتداءً) اس مجموعہ کا نقصان اور آخر کار اس کا مٹ جانا تصور کیا جائیگا۔ پس ہر ایک مجموعہ کی بقا صرف اسی صورت سے ممکن ہے کہ اسکے چھوٹے سے چھوٹے جزو کا وہی تحفظ کیا جائے جو اسکے بڑے سے بڑے جز کا کیا جا سکتا ہے۔

دیکھو ایک حسین کے حسن کے لئے تمام اعضا بدن کا موزوں ہونا شرط ہے۔ بیاض بشرہ اور سواد مو۔ آنکھ کی بڑائی اور ہاتھ پیر کی موزوں چھوٹائی۔ قد و قامت کی خوبی اور چال ڈھال کی پسندیدگی حتّٰی کہ صوت و کلام کی دلکشی اور دوسری بہت سی شرائط حسن کا پایا جانا ضروری ہے۔ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ اگر آنکھ چھوٹی ہے تو ہو کہ رنگ تو سفید ہے۔ اگر آواز بھدّی ہے تو ہو دہن تو غنچہ مثال ہے اور اگر بعض اعضا میں موزونیت نہیں تو نہ ہو کہ اور دوسرے بعض میں تو ہے حسن معنوی میں لو تو مثلاً ایک جامع عالم اسیوقت اس اعلیٰ خطاب کا اہل تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ علوم عالیہ کے درجہ میں قرآن و سنۃ اور اصول و فروع فقہ وغیرہ سے واقف ہو اور علوم آلیہ کے درجہ میں ادبی فنون پھر معقولات کی اصطلاحات سے بے خبر نہ ہو۔ نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ فقہ کی جزئیات سے واقف نہیں تو حدیث سے تو ہے اور اگر قرآن نہیں جانتا تو اصول تو جانتا ہے پھر کیا بوالعجبی ہے کہ ایک حسین کا مجموعی حسن تو چند جزوی نقصانات سے بدنما ٹھہر جائے

اور ایک عالم کی جامعیت پر چند فنون کی لاعلمیوں سے حرف آجائے لیکن خدا کے دین کی حسین ہیئت و شکل اور جامع حقیقت ہیں جبکہ وہ غربت زدہ ہو کر ان مصطلح ریفارمروں کے ہاتھوں پڑے نہ صرف جزوی بلکہ اصولی قطع و برید سے بھی کوئی بدنمائی رونما ہو۔

یہ بنتے ہوئے روشن خیال اطلاق کی اڑ لیکر اسکو صورۃً اور سیرۃً بدلدیں۔ التباس و تشبہ بالکفار سے اس کا نقشہ پلٹ دیں۔ اور سینکڑوں جدید سانچوں میں ڈھالکر اسکو دنیا کے سامنے لائیں لیکن پھر بھی وہ اسی صدر اول کا تام و کامل اور حسین و جمیل اسلام رہے۔ اور یہ برعکس نام نہند روشن خیال نہایت ہی متقشف اور قدیم روایات کے حامل مسلمان پکارے جانے کے مستحق رہیں؟ کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون ؞

پس اگر اس قسم کے مجموعوں کو جو اپنے بہت سارے اجزا پر محیط ہیں طلب کیا جائے تو ضرور ہے کہ معہ تمام اجزا ہی کے طلب کیا جا سکتا ہے ورنہ اگر مجموعہ کی طلب کے وقت اسکے اجزا مطلوب نہوں یا کچھ ہوں اور کچھ نہوں تو یہ طلب ہی محض لغو اور عبث ہوگی۔

پس نہ تو ایک طالب مجموعہ کی غرض مجموعہ کے تمام اجزا ارجمع کئے بغیر پوری ہو سکتی ہے اور نہ اس مامور ہی کو مجموعہ کا امتثال کنندہ کہا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ہم نے کسی معمار کو ایک مکان بنانے کا امر کیا اور اس نے ایک دیوار یا صرف محراب بنا کر سمجھ لیا کہ اس نے ہمارے امر کی تعمیل کر دی کیا وہ صحیح سمجھا؟ ہرگز نہیں کیونکہ مکان ایک کل اور مجموعہ ہے جو عرفاً دیواروں ستونوں۔ چھتوں در و دریچہ وغیرہ اجزا پر مشتمل ہے۔ فقط دیوار یا فقط محراب کو مکان نہیں کہتے۔ پس یہ مجموعہ اپنے سارے ہی اجزا سے ظہور پذیر بھی ہو سکتا ہے اور پورے ہی اجزا کو تعمیر کرکے ایک معمار ہمارے امر کا حق ادا کرنے والا بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی فطری اصول پر سمجھ لو کہ اگر بارگاہ حق سے کسی مجموعہ کی مانگ ہو (خواہ وہ مجموعہ ایمانیات میں سے ہو یا افعال میں سے پھر اخلاق میں سے ہو یا اوصاف میں سے) اور بندے اس مجموعہ کے کسی ایک آدھ جزو کو تو حاضر کر دیں اور بقیہ اجزا کو لا یا س کہہ کر چھوڑ دیں تو کیا ان کو اس نادان معمار

کسی طرح نہیں کہا جائیگا کہ انہوں نے بھی امر آہی کا کوئی حق ادا نہیں کیا اور ہرگز وہ امر کی مؤنت سے
ہلکے نہیں ہوئے؟ ضرور کہا جائیگا۔

اعیان | مثلاً اعیان میں تو تو قرآن کریم نے۔

فاغسلوا وجوھکم۔ (وضو کرتے ہوئے) اپنے چہروں کو دھوؤ۔

میں امر کے ذریعہ ہم سے چہرہ دہونے کی طلب کی۔

اور وجہ یا چہرہ ایک عین ہے جو چند اجزاء پیشانی۔ آنکھ۔ ناک۔ رخسارہ۔ اور ذقن وغیرہ پر حاوی ہونے کے سبب ایک مجموعہ اور کل ہی۔ اسلئے تنہا پیشانی یا رخسارہ کو چہرہ نہیں کہہ سکتے پس اگر ہم نے فقط رخسارہ یا پیشانی دھوڈھالی یا تنہا ناک پر پانی کے چند قطرے ٹپکا دیئے تو نہ کہا جائیگا کہ ہم نے چہرہ دھولیا۔ کیونکہ چہرہ ان انفرادی اجزاء کا نام نہ تھا بلکہ بحیثیت مجموعی کل اجزاء کا اسلئے یقیناً ہم اس امر کی تعمیل سے قاصر رہے۔ کسی طرح یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ چہرہ کا دہونا ایک حقیقۃ مطلقہ تھا اگر ہم اسکے کسی فرد یا جزو پر عامل ہوگئے تو ہم تعمیل امر سے عہدہ برآ بھی ہوگئے۔

افعال | اسی طرح افعال شرعیہ کے سلسلہ میں دیکھو تو صلوۃ ایک شرعی فعل ہے جس کے اقامۃ کا قرآن کریم نے ہمیں حکم فرمایا کہ۔

اقیموا الصلوۃ۔ نماز درست کرکے پڑھو۔

یہ فعل صلوۃ ایک کل اور ایک مجموعہ ہی۔ جسکے اجزاء مثلاً رکوع و سجود قیام و قعود۔ اور قومہ جلسہ وغیرہ ہیں۔ تنہا رکوع یا سجود یا قیام کو نماز نہیں کہتے۔ پس اگر ہم نے صرف رکوع کرلیا یا صرف قیام کرکے سلام پھیر دیا۔ یا دو رکعۃ کی نماز کو ایک رکعۃ پر ختم کردیا تو بلا شبہہ ہم نے نماز نہ پڑھی کیونکہ نماز ان انفرادی اجزاء کا نام نہ تھا بلکہ مجموعہ کا اور جب مجموعہ ادا نہ کیا گیا تو ہم امر صلوۃ کے امتثال سے بالکلیہ قاصر رہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض اجزاء ادا کر دینے سے صلوۃ ادا ہو گئی کہ وہ امر کے ذریعہ طلب کئے جانے کے سبب ایک حقیقۃ مطلقہ تھی۔

اخلاق | اخلاق حسنہ کے سلسلہ میں اگر ہم کسی کو امر کریں کہ۔

اکرم ھذا الرجل ۔	اس شخص کا اکرام کرو۔

تو ظاہر ہے کہ اکرام (جو ایک خلق حسن ہے) ایک مجموعہ ہے جس کے مجموعی معنی دو اجزاء پر مشتمل ہیں۔ ایک ہر وہ فعل بجا لانا جو اُسکو خوش معلوم ہو۔ اور دوسرے ہر اس فعل سے بچنا جو اُسے ناخوش معلوم ہو۔ پس اگر ہمارا مامور ایک جانب تو مہربانی و تلطف سے پیش آئے۔ اُسے [illegible] وغیرہ [illegible] اور دوسری جانب اُسے زدوکوب بھی کرے تو نہیں کہا جائیگا کہ اُس نے ہمارے امر کا امتثال کیا کیونکہ زدوکوب کے ساتھ ہدیہ دینا اسلئے اکرام نہیں کہ اسکی حقیقت کا وجودی جزو تطییب قلب تو پایا گیا مگر عدمی جزو اکفافِ اذیٰ نہ پایا گیا اور بغیر دونوں جزووں کے اس مجموعہ کا وجود [illegible]۔

اوصاف اوصاف کے سلسلہ کو لو تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible] کا حکم فرمایا ہے۔

مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ ۔	جو تم میں سے اللہ اور قیامت [illegible] ضروری ہے کہ اپنے مہمان [illegible]

ضیافۃ یا اکرام ضیف ایک وصف حسن ہے جسکی حقیقت یہ ہے کہ تعظیم و [illegible] کے ساتھ مہمان کو سیر و شکم رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ اس ضیافۃ کی حقیقت مہمان کو چند [illegible] سے قائم نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو یقیناً شرعی امر کا امتثال نہ کیا کیونکہ ضیافت کے بعض اجزاء تو پورے کر دئے اور بعض چھوڑ دئے۔ اور جبکہ مجموعی اجزاء ہی سے اسکی حقیقت قائم ہوسکتی تھی تو ہم نے بعض اجزاء کو ترک کر کے اسکی حقیقت کو ادھورا کر دیا جو ادا شدہ نہ سمجھی جائیگی۔

مخالفۃ کفار ٹھیک اسیطرح ترک تشبہ یا مخالفۃ کفار ظاہرا و باطنا ایک شرعی فعل ہے [illegible] کے ذریعہ ہم سے طلب کیا گیا۔

یہ مخالفۃ کفار ایک کل اور ایک مجموعہ ہے جو [illegible] سیاسی اوضاع و اطوار شعائر اور خلاصہ یہ کہ ہر ایک ظاہری و باطنی [illegible] پر حاوی ہے ان میں سے کسی ایک آدھ مخالفۃ کا نام مجموعی مخالفۃ نہیں ہے۔ پس [illegible]

میں تو ان سے مخالفت کر لی۔ اور باقی شعبوں میں اپنے لاابالی کی مطلق العنانی اور لاابالی پن سے ان کے مشابہ اور موافق بن گئے۔ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے اس مطلوب مخالفت کو ادا کر دیا اور امر و نہی کی لوجھ ہلکے ہو گئے۔ کیونکہ مطلوبہ مخالفت جبکہ ایک مجموعہ تھا تو وہ مجموعہ اپنے تمام اجزاء ہی سے قائم ہو سکتا تھا نہ کہ ایک آدھ جزو سے۔

پس جس طرح ان مذکورہ نظائر میں نہیں کہا جا سکتا کہ امر کے ذریعہ ان اعمال و افعال اور اخلاق و عبادات کی حقائق مطلقہ طلب کی گئی ہیں۔ جو چہرہ میں فقط ناک دھو لینے اور نماز میں صرف سجدہ کر لینے اور اکرام میں زرد کو سے کیا تھا۔ ہو دیا ہے اور ضیافت میں مہمان کو ایک آدھ لقمہ کھلا دینے سے پوری ہو سکتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ سارے ہی اجزاء کو عمل میں جمع کیا جائے۔

ٹھیک اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ موافقت انبیاء اور مخالفت کفار یا ترک تشبہ (جبکہ اس کا عام اور جمع استغراقی ہونا ثابت کیا جا چکا) ایک حقیقت مطلقہ ہے جو صرف کسی ایک آدھ جزئی میں مخالفت کفار کر لینے سے ادا ہو سکتی ہے۔ ضرورت نہیں ہے کہ خلاف کے سارے ہی اجزاء زیر عمل آئیں کیونکہ ہر ایک عام یا مجموعہ جبتک کہ شریعت ہی اُسے مخصوص البعض نہ بنا دے اپنے سارے ہی اجزاء سے قائم ہو سکتا ہے نہ کہ ایک آدھ جزو سے۔ اور ہر ایک مجموعہ جب طلب کیا جائیگا تو وہ سارے ہی اجزاء کے پیش کرنے سے ادا بھی ہو سکیگا نہ کہ ایک آدھ جزو کے۔

پس نکتہ چین تو موافقت انبیاء اور مخالفت کفار کو حقیقت مطلقہ گمان کر کے اس دھوکہ میں تھے کہ اگر اس کا اکثر حصہ چھوٹ کر ایک آدھ جزو بھی زیر عمل آ جائے تو کافی ہے اور میں اُسکو حقیقت عامہ یقین کر کے اس علم پر ہوں کہ اگر اکثر حصہ زیر عمل آ کر ایک آدھ جزو بھی چھوٹ جائے تو وہ بھی ناکافی اور ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ فتفاوت مابین مشرق و مغرب۔

یہ گفتگو اس تقدیر پر تھی کہ موافقت و مخالفت کو ہم نے حقیقت مطلقہ تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ بلکہ حقیقت عامہ مانا تھا۔ لیکن اگر ہم بھی نکتہ چینوں کی طرح تھوڑی دیر کے لئے ان حقائق کو مطلق ہی تسلیم کر لیں تب بھی ان کا یہ منشاء تو کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ وہ ان حقائق کی کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کر کے

امر و نہی کے بوجھ سے بری الذمہ ہو جائیں اور ادا حقیقت کے لئے صرف اتنا ہی جزوی عمل کافی خیال کرنے لگیں۔ کیونکہ ہم موافقۃ انبیاء اور مخالفۃ کفار کو ایسا مطلق نہیں تسلیم کرتے جس کے کسی ایک آدھ ہی جزو کو شریعت کافی سمجھتی ہو۔ بلکہ ایک ایسا مطلق مانتے ہیں جس کا فرد کامل شریعت کو مطلوب ہے اور ظاہر ہے کہ فرد کامل وہی ہو سکتا ہے جسمیں کما و کیفاً حقیقت کا غالب اور معظم حصہ آجائے۔

ورنہ اگر اتبعوا سے کوئی سا جزوی اتباع اور خالفوا سے کوئی سا جزوی خلاف مطلوب ہی تو یہ طلب ہی عبث اور لا طائل ہو جاتی ہے کیونکہ ان دونوں صیغوں سے خطاب مسلم کو ہے اور مسلم جب تک کہ وہ مسلم ہے طبعی اور فطری طور پر ضرور ہے کہ ادھر تو اتباع انبیا کے کسی نہ کسی جزو پر اعتقاداً یا عملاً قائم ہو اور ادھر خلاف کفار کے کسی نہ کسی جزو پر ضرور چلتا ہو۔ ورنہ اگر ایک مسلم اتباع انبیاء کے کسی ایک جزو کو بھی اعتقاداً یا عملاً لئے ہوئے نہو۔ اور ایسے ہی خلاف کفار کے کسی شعبہ پر بھی قائم نہو گویا بالفاظ دیگر عدو انبیاء ہو اور حبیب کفار ہو۔ تو وہ مسلم ہی کب ہے کہ ان اوامر کا اسے مخاطب سمجھا جائے۔

اور پھر یہ جزوی موافقۃ اور مخالفۃ طبعی طور پر نہ صرف مسلم ہی میں پائی جانی ضروری ہے بلکہ میرے خیال میں تو کوئی کافر بھی ایسا نہیں نکل سکتا جو اسوۂ انبیاء کے کسی نہ کسی جزو کا متبع اور اسوۂ دجل و شیطنت کے کسی نہ کسی جزو سے متنفر نہو۔ پس جبکہ اس اتباع و خلاف کے کسی نہ کسی جزو کا پابند ہونا ایسا طبعی اور غیر اختیاری امر ہے کہ مسلم ہی نہیں کافر تک اس کا پابند ہے اور وہ پابندی بلا کسی جبر امر کے سبعی ہے تو پھر اتبعوا اور خالفوا کے اطلاق سے بھی وہی جزوی حصہ طلب کیا جانا محض بے سود اور تحصیل حاصل ہے اور گویا ایک مسلم کو کافر کی برابر رکھنے پر راضی ہو جانا ہے اس لئے ضرور ہے کہ امر و نہی سے اس اتباع و خلاف کا وہ حصہ مطلوب ہو جو اس طبعی اور غیر اختیاری حد سے کچھ آگے ہو۔ بس اسی غالب حصہ کو ہم ان حقائق مطلقہ کا فرد کامل کہینگے۔

پس اتباع انبیاء کا فرد کامل تو یہ ہے کہ وہ ایک آدھ جزئی سے گذر کر اس حد تک پہنچ جائے

گو یہ مسلم اپنے اکثری حالات کے اعتبار سے عُرف عام میں کسی نبی کے مسلک کا پیرو اور اسکے مخالف مسلک سے نفور پکارا جانے لگے۔ اور خلاف کفار یا ترک تشبّہ کا فردِ کامل یہ ہے کہ وہ ایک آدھ جزئی سے گذر کر اس حد پر آجائے کہ ایک مُسلم کفار سے صورتاً و سیرتاً تدیناً و تمدناً الگ ہونے کے سبب عرفِ عام میں مخالفِ کفار کہا جانے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مُمیّز درجہ (جسکو ہم مطلق کا فردِ کامل کہہ رہے ہیں) اس مطلق کی کسی ایک آدھ جزئی پر عمل کرنے اور بقیہ جزئیات کو لااُبالی پن سے چھوڑ دینے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ظاہر و باطن کے اکثر اور غالب شعبوں پر عملدرآمد کرنے سے ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ اسلئے جب شریعت ان مطلق حقائق کو طلب کریگی تو یقیناً اُن کے اس مُمیّز درجہ ہی کو طلب کریگی اور اسلئے اس مُمیّز درجہ کو ادا کئے بغیر کسی طرح اس مطلق کی ادائگی متصوّر نہیں ہوسکتی۔

پس نکتہ چین مطلق کی آڑ لیکر جس آزادی مطلق العنانی اور بے دینی کی شرعی رنگ میں بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ وہ قائم نہو سکی اور جسقدر قائم ہوئی تھی وہ الحمدللہ منہدم ہوگئی۔ اور ثابت ہوگیا کہ جبتک ترکِ تشبّہ کا کل یا غالب حصّہ زیرِ عمل نہ آجائے۔ اُسوقت تک کوئی مُسلم تارکِ تشبّہ نہیں کہلایا جاسکتا۔

آخر میں ہم ایک عجیب و غریب نتیجہ لکھکر حدیث مَن تشبّہ کی اس مناظرانہ بحث کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ سیّد صاحب نے باوجودیکہ حدیث مَن تشبّہ کی تردید و تکذیب میں کوئی انتہائی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ "جادو وہی ہے جو سر پر چڑھکر بولے" وہ صد انکار کے باوجود بھی مسئلہ تشبّہ کو مان لینے پر قہراً مجبور ہوگئے۔ انہوں نے حدیث مَن تشبّہ کی فطری حقیقت سے بھاگنے کی کتنی ہی سعی کی۔ مگر فطرت نے اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور آخر کار انہی کے منکرانہ کلام سے مقرانہ اعتراف کرالیا گو یہ اعتراف اُن کے خلاف مرضی ہو۔ وہ حدیث مَن تشبّہ کو بزعم خود پوری طرح رد کردینے اور غیر معقول ٹھیرا دینے کے بعد بر سبیل تنزّل اس حدیث کا ایک محل تجویز فرماتے ہیں کہ۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کا جس کو میں آئندہ سے قول کہونگا کیونکہ میرے

ولحد کی رعایتیں وغیرہ سب ہی امور گویا آپ کے نزدیک معاذ اللہ لغو اور عبث ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ حکمیات شریعت کا ایسا برملا جحود و انکار کہ جنہیں کلام رسول بھی بہ جاسکے اور اجماع امت بھی اسلام وایمان کی ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور اسلئے ان فروعات شرعیہ میں آپ ہمارے مخاطب بھی نہیں رہتے کہ کلام کا سلسلہ آگے بڑھے۔

ان اگر آپ کے نزدیک واجب ہے کہ مسلمان میت کی تجہیز وتکفین اسلامی ہی طریق پر ہونی چاہئے اور ہرگز جائز نہیں کہ مسلمان کا مردہ ہندو کیطرح جلا دیا جائے۔ یا پارسیوں کیطرح چیل اور کوؤں کی نذر کر دیا جائے یا عیسائیوں کیطرح کسی ستون میں کھڑا چن دیا جائے تو پھر آپ کے اقرار سے صاف طور پر یہ اقرار بھی نکل آتا کہ مسلمان کیلئے یہ قومی امتیاز اور ترک تشبہ بھی واجب ہے۔

کیونکہ آپ کے نزدیک جب موت زحام میں اسلامی تجہیز وتکفین کا واجب بغیر ظاہری امتیاز کے ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ اور وہ آپ کے نزدیک واجب ہو تو کوئی وجہ نہیں جاتا ہے کہ جس پر واجب کی ادائگی موقوف ہو وہ خود بھی واجب ہوتا ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ امتیاز اور ترک تشبہ بھی ایسے اوقات ازدحام میں واجب ہے۔

اور الحمد للہ کہ آپ ہی کے منکر قلم سے کم از کم موت زحام کے وقت امتیاز اور ترک تشبہ کا وجود بھی ثابت ہوگیا اور وجوب بھی۔ اور پھر جبکہ موت ازدحام کے وقت آپ کو امتیاز اور ترک تشبہ کے وجود و وجوب ماننے سے چارہ نہ رہا۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کو موت زحام سے پہلے زندگی کی ہر ہر ساعت میں بھی اس ترک تشبہ کے وجود و وجوب ماننے سے کوئی مفر نہیں رہا۔

کیونکہ سوال یہ ہے کہ یہ قومی امتیازات (جن سے ایک مردہ بعد الموت پہچانا جاسکتا) آیا اس موت زحام ہی کے لئے اختیار کئے گئے تھے یا موت سے پہلے کی عام زندگی کے لئے اگر کہا جائے کہ یہ مخصوص لباس وغیرہ محض موت ہی کے استعمال کے لئے مہیا کئے گئے تھے۔ اور ان کی غرض صرف یہی تھی کہ ان میں موت آجائے تو یہ اسوجہ سے غلط ہے کہ نہ تو آجتک دنیا کی کسی قوم نے محض موت کیلئے کوئی وردی تجویز کی (کہ ایسا کرنا کوئی معتد بہ غرض ہی نہیں تھی) اور نہ کسی کے علم میں موت کا

کوئی وقت ہی متعین ہوا کہ اس کیلئے ایسی تیاری کرلی جائے۔

پس دوسری صورت خود بخود متعین ہوگئی کہ یہ امتیازی نشانات ان مرنے والوں کی زندگی کے نشانات تھے نہ کہ موت کے اور ان مرنے والوں نے (جو کسی اسلامی امتیاز کے سبب اسلامی تجہیز وتکفین سے مشرف ہوئے) اپنی پوری ہی زندگی میں یہ چاہا کہ وہ اپنے کو غیر مسلم اقوام سے صورتاً وسیرتاً ممتاز رکھیں اور ترک تشبّہ پر جمع رہیں تاآنکہ بعد الموت بھی جبکہ وہ غیر مسلم اقوام کے مُردوں میں گڈمڈ ہوں انہیں مسلم ہی پکارا جائے اور مسلموں ہی کے احکام و اعمال ان پر جاری کئے جائیں۔

پس سید صاحب کے کلام سے ترک تشبّہ کا وجود و وجوب نہ صرف موت زحام ہی کے وقت کیلئے نکلا بلکہ زندگی کی ہر ہر ساعت کیلئے بھی نکل آیا۔ اور یہی وہ مدعیٰ تھا کہ جس کی تائید کیلئے تو ہم قلم بدست تھے اور تردید کیلئے سید صاحب نے قلم اٹھایا تھا گو ان کے منافق قلم نے انجام پر پہنچ کر انہیں نہ ہونے دیا اور ان کے ساتھ نفاق برتا بلکہ اگر ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ ان جنباز مُردوں کو قرائن سے موت اژدحام کا علم ہو جائے۔ جیسا کہ کسی وبا کے ہیجان کے وقت عموماً وحشت زدہ تیماردار مُردوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور اس کس مپرسی کی حالت میں مسلم و غیر مسلم مُردوں کے مخلوط و گڈمڈ ہو جانے کا ظن غالب ہو یا کوئی جنگ عظیم برپا ہو اور مسلم و غیر مسلم مُردوں میدان مصاف کے پُر ہو جانے کا خطرہ آنکھوں سے نظر آ رہا ہو اور اُسوقت یہ مرنے والے اسی نیت سے اسلامی لباس و اوضاع اختیار کریں کہ اُن کی موت اسی ہیئت میں آجائے تب بھی ہمارا ہی مقصد روشنی میں آتا اور ترک تشبّہ کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ سوال یہ ہے کہ جب وہ بعد الموت اس لباس و وضع سے از خود کوئی بھی حظ حاصل نہیں کر سکتے تو پھر انہوں نے عین مرنے کے وقت اس ترک تشبّہ کو کیوں اختیار کیا؟ اگر اسلئے کیا (اور ظاہر ہے کہ محض اسی لئے) کہ وہ بعد الموت مسلمان سمجھے جائیں اور ایسا نہو کہ غیر اقوام کے مُردوں میں شامل کر کے انہیں اسلامی احکام کے اجراء سے محروم کر دیا جائے۔ تو پھر میں کہتا ہوں کہ جس نمود اسلامی اور اجراء احکام کی علت نے انہیں بعد الموت ترک تشبّہ پر مجبور کر دیا وہی علت قبل الموت بھی موجود ہے جو زندگی میں انہیں اسلامی شعائر اور ترک تشبّہ پر مجبور کر سکتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان اگر اپنی زندگی

میں غیر اقوام سے تشبّہ ترک نہ کرے بلکہ نصرانی صورت اور یہودی ہیئت بنجائے تو کتنے ہی اسلامی احکام اور دینی اوضاع کی برکات سے قبل الموت بھی محروم ہوجائے۔ پس اگر یہ محرومی بعد الموت خطرناک ہے تو قبل الموت اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ یہ ہی حیات قبل الموت حیاتِ بعد الموت کا خاکہ اور نقشہ ہے جس پر آخرۃ کی تعمیر کھڑی کردی جائیگی۔ پس اگر زندگی اسلامی ہے تو موت کے بعد کی زندگی بھی اسلامی ہو سکتی ہے یعنی اگر دنیا کی زندگی میں ایک مسلم تمام اقوام کفر سے ممتاز اور الگ ہے تو آخرۃ کی زندگی میں بھی اپنے حشر و نشر اور دائمی ٹھکانوں کے لحاظ سے ممتاز اور الگ ہی رہیگا۔ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ۔

تحشرون کما تموتون وتموتون کما تحیون۔	تمہارا حشر تو ویسا ہوگا جیسے مرے تھے اور مروگے اس حال میں جسمیں زندگی گذاری تھی۔

پھر جسکو غیر اقوام کے تشابہ و التباس سے یہ نفرت ہو کہ وہ موت کے بعد تک کے لئے ترک تشبّہ کا سامان مہیا کرجائے تو کیا وہ زندگی میں اسے پسند کرے گا کہ اپنی صورت و سیرۃ تشبّہ کے ذریعہ مشتبہ بنالے درانحالیکہ شرعًا و عرفًا مشتبہ صورت۔ مشتبہ کپڑا مشتبہ پانی اور ہر مشتبہ چیز کسی حال میں بھی درخور التفات اور قابل اعتبار نہیں۔ پھر حیرت ہے کہ عام مسلمین کی سبیل اور راہ تو یہ ہے کہ وہ موت کے بعد بھی تشبّہ بالاقوام سے بچنے کی سعی کریں تاکہ اجراء احکام اسلامی سے محروم نہ ہیں اور سید صاحب کی غیر سبیل المؤمنین یہ ہے کہ وہ زندگی میں بھی تشبّہ بالاغیار کو لاحرج اور لاباس کی نذر کردیں تاکہ مسلم قوم پر اسلامی احکام کے بجائے کفر کے احکام کا اجراء ہوجائے۔ فما اصبرھم علی النار ذالک بان اللہ نزل الکتٰب بالحق وان الذین اختلفوا فی الکتاب لفی شقاق بعید۔

بہرحال سید صاحب کھینچ کھانچ کر اس حدیث کا کوئی بھی محمل تجویز کرلیں خواہ موت زعامہ ہو یا حیاۃ زعامہ ہر صورت میں ترک تشبّہ کا وجود اور وجوب اسی محمل سے نکل آئیگا اور وہ حدیث کو بامعنی ماننے کے بعد اسکی حقیقت (ترک تشبّہ) کے دائرہ سے کبھی باہر نہ نکل سکیں گے۔ اور یہ پہلے ثابت ہوچکا ہے کہ اس حدیث کو بامعنی ماننا ناگزیر ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ اسلئے ہر صورت میں

ترک تشبہ کا وجوب بھی اس حدیث سے نمایاں ہوتا رہیگا ولو کرہ المنکرون۔

پس سید صاحب کی تمام وہ بحثیں جو حدیث من تشبہ کے خلاف انہوں نے اٹھائیں اپنے مقدمات کے لحاظ سے تو مسئلہ تشبہ کا ایک نامعقول ساز ذکر رہی تھیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے اس کا اثبات کرنے لگیں جو ہمارا عین مدعا تھا۔ پس جس کلام کا اول و آخر باہم ٹکرا رہا ہو آیا اس کلام کو مردود کہنا چاہیئے یا اس حدیث من تشبہ کو جس کے خلاف یہ کلام اٹھایا گیا تھا۔

بہرحال واضح ہوگیا کہ حدیث من تشبہ فہو منہم ایک ایسا عقلی و نقلی اور حسی و شرعی قانون ہے کہ اس کی شرعی حیثیت پر مبطلون کی سفیہانہ کارروائیاں کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں اور کھل گیا کہ منکروں کی ناجائز نکتہ چینیاں اور بے جا اعتراضات محض ایک دھوکہ اور خدعہ تھے جنکا پردہ چاک ہوگیا اور حدیث بے غبار ہوکر اسطرح دکھلائی دینے لگی کہ نہ اسکی سند میں انقطاع ہے۔ نہ رواۃ میں ضعف ہے۔ نہ اسپر مورد متعین نہونے کا الزام عائد ہے نہ اس پر کسی شرعی نتیجہ کو مستلزم نہو نیکا دھبہ ہے۔ نہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل آپ کے اس قول کے معارض ہے۔ نہ حضور اور صحابہ کا کوئی فعل اس کی شرعی حقیقت کے لئے مبطل ہے۔ نہ کسی چیز سے کفر لازم نہ آنا اس کی ممنوع حقیقت کو جائز کرسکتا ہے۔ نہ ظاہر کے باطن پر اثر نہ ڈالنے کا مغسطہ اسکی حقیقی تاثیرات کو فنا کرسکتا ہے۔ نہ وہ ایسی حقیقت مطلقہ ہے جسکی ایک آدھ ہی جزئی عملاً مطلوب ہو۔ نہ اس کا محل فقط موت اژدہام ہی ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا واضح الدلالۃ۔ نتیجہ خیز۔ غیر متعارض۔ بین التاثیر۔ اور عامۃ تام شرعی اصول ہے جو نہ تو کسی قارض کے فرض کر لینے سے بنتا ہے۔ اور نہ کسی منکر کے انکار سے بگڑتا ہے۔ وہ خدا کے غیر متزلزل اور لا تبدیل کلام سے ثابت شدہ ایک حقیقت ہے جسمیں کسی محرف کی تحریف اور مبطل کے ابطال کو راہ نہیں ملسکتی۔

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔	نہ آتیں غیر واقعی بات آسکی طرف آسکتی ہے اور نہ پیچھے کی طرف سے یہ خدائے حکیم و محمود کیطرف سے نازل کردہ ہے۔

پس اگرچہ ہندوستان کے مشہور لیڈر اور مصلح ریفارمر سید نے اس حدیث رسول کو روایۃ

"درایۃً مردود اور ناقابل عمل ٹھہرانے میں تہذیب الاخلاق کے کتنے ہی صفحات سیاہ کئے اور بے حد مساعی سے کام لیا لیکن اسی حدیث کے متعلق اُمتہ مرحومہ کے بے تعداد علماء کی نکتہ سنجیوں اور ائمہ دین کی کتنی ہی بصیرۃ افزا حقائق کو سامنے رکھکر ہم سید موصوف کی ان تمام مساعی کو چند توہمات اور بعید از قیاس تخیلات سے زیادہ وقعت نہیں دیسکتے۔

وہ اس حدیث کے رد و تضعیف میں اگر کوئی وزنی اشکال پیش کرتے تو ممکن تھا کہ ہم بھی کسی مزید تفصیل سے کام لیتے۔ لیکن صورت موجودہ میں ان مذکورہ شبہات و وساوس کی مقاومت کیلئے ہماری چند سطریں جو اس فصل میں پیش کیگئیں کافی اور ان کے تار عنکبوت کا طلسم کھولدینے کے لئے وافی ہیں۔

آخر میں ہم اسپر اظہار حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سید صاحب نے تو تشبہ کے بارہ میں اپنی خود ساختہ اور دہ در دہ مشرب میں اسقدر وسیع الخیالی کا ثبوت دیا کہ یہود و نصاریٰ۔ ہنود و مجوس اور دنیا کی کوئی گمراہ قوم بھی اُن سے ناراض نہ رہ سکی۔ لیکن اسلام کے ربانیوں نے تشبہ کے متعلق اپنا دائرۂ عمل اتنا تنگ اور محدود بنالیا۔ کہ وہ کفار تو کفار اہل بدعات کی بھی رضا و خوشنودی حاصل نکرسکے کیونکہ ان کا مسلک تو امام غزالی کی لسان میں یہ ہے کہ۔

مهما صارت السنة شعارًا لاهل البدعة قلنا بتركها خوفا من التشبه بهم۔ (احیاء العلوم کتاب السماع)۔	جبکہ کوئی سنت مبتدعین کا امتیازی شعار بنجائے تو ہم ایسی ان کے مشابہ بن جانے کے خوف سے اس کے بھی ترک کا فتویٰ دیں گے۔

کیونکہ انکی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ سنت پر عمل کرنا تو سنت ہی ہے لیکن تحفظ حدود فرض ہے اسلئے انہوں نے اس سنت کے ترک کا فتویٰ صادر کردیا جو مبتدعین کی جماعت کا امتیازی نشان قرار پاجائے اور اس امتیاز کا دامن سنبھال لیا جو اہل سنت و اہل بدعۃ کو الگ الگ نمایاں کردے اور ان میں سے اس مہلک تشابہ کا استیصال کردے۔

پس اس روایۃ سے ان اسلاف کرام کی تو انتہائی احتیاط کھلجاتی ہے کہ وہ مبتدعین کے تشبہ سے

فصل

حدیث لارہبانیۃ فی الاسلام

گذشتہ فصل میں جن چند نکتہ چینیوں کے جواب دئے جاچکے وہ ایک نقض کی حیثیت رکھتی تھیں یعنی ان کے ذریعہ ترک تشبہ کے متعلق ہمارے پیش کردہ دلائل پر نقض وارد کرکے ان کو مخدوش بنانے کی سعی کی گئی تھی۔ جو بحمد اللہ پادر ہوا ثابت ہوئی۔ اب ہم ایک ایسی نکتہ چینی کا جواب دینا چاہتے ہیں جو معارضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی جس کے ذریعہ نکتہ چینوں نے بجائے ہمارے دلائل کو مخدوش کرنے کے ہمارے مدعا (ترک تشبہ) کے خلاف خود اپنی دلیل قائم کی ہے۔ اور یہ دکھلانا چاہا ہے کہ مسئلہ تشبہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں بلکہ ایک ایسی غیر مشروع چیز ہے کہ جسکو خود شریعت ہی رد کر رہی ہے۔

اس معارضہ کا حاصل یہ ہے کہ۔

ترک تشبہ سے تو سخت تنگی اور محدود دلی کی بنیاد پڑتی ہے۔ اسکی تعلیم سے تو اسلام کا وسیع دائرہ تنگ ہوا جاتا ہے۔ ہر چیز پر حدود و قیود لگ جانے کی وجہ سے معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ معاشرت کے بہت سے سامان لغو اور بیکار ٹھیر جاتے ہیں۔ دنیا کی اقوام سے کسی اچھے اور مفید نظریہ سے استفادہ کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اور ان حدود و قیود کی بدولت اسلامی قوم کی ترقی رک جاتی ہے۔ گویا راہبانوں کی طرح بہت ہی قلیل التعداد افراد رہجاتے ہیں جو اس رہبانیت نما اصول (ترک تشبہ) کے ماتحت اسلام میں زندگی بسر کرسکیں۔ حالانکہ اسلام ایسی تنگیوں اور تنگ نظریوں سے بہت بالاتر ہے۔ اس نے تو اقوام عالم کو یُسر اور سہولت کا پیغام سنا کر اس قسم کی تمام رہبانیت آمیز تنگیوں سے بچا لیا تھا اور اعلان دیدیا تھا کہ۔

لارہبانیۃ فی الاسلام۔	اسلام میں رہبانیت اور تنگی نہیں ہے۔

لیکن علمار اسلام نے ایسے ناقابل عمل اور رہبانیت نواز تشددات سے ان میں منافرت پھیلانی شروع کر دی ان کو وسیع المشربی۔ فراخ حوصلگی اور روشن خیالی کے بجائے اُسی تنگی۔ محدود الخیالی اور تاریک دماغی کیطرف لیجانا چاہا جو اس رہبانیت کا پیش خیمہ تھی۔ یہانتک کہ علمار کی اس غیر آل اندیشی سے اغیار چھوڑ خود اپنے بھی اسلام سے بیزار ہونے لگے۔ اور اسلام کی ہر دلعزیز متاع صرف ایک محدود طبقہ کی جاگیر ہو گئی۔

مسئلہ زیر بحث کے خلاف جنگ کرنے والوں کا بڑے سے بڑا ہتھیار یہی حدیث کا رہبانیۃ ہے جسکو وہ مسئلہ ترک تشبہ کے ابطال کیلئے آزمایا کرتے ہیں حتیٰ کہ اس مسئلہ کے خلاف معارضوں کی تمام وہ تو ہیں جنکا سطور بالا میں حوالہ دیا گیا ہے۔ اسی حدیث کی ظاہری دلالۃ اور اقتضا سے پیدا کر کے علمار اسلام کے خلاف پیش کی جاتی ہیں۔

لیکن مجھے تعجب ہے کہ یہ حدیث کے دلدادہ اور عشاق جنہوں نے اس حدیث سے علمار کو تنگ خیالی کا ملزم ٹھیرایا۔ اس ایک حدیث کے مقابلہ میں ان سینکڑوں آیات و احادیث کو کیوں چھوڑ رہے ہیں جو مسئلہ تشبہ کے اثبات پر روشنی پڑتی ہے اور جنکو تفصیل کے ساتھ ہم پہلے باب میں پیش کر چکے ہیں۔ آخر منع تشبہ کے دلائل بھی تو کسی عالم کے ذاتی اقوال و افعال نہیں بلکہ ان ہی احادیث نبوی کا ذخیرہ ہیں جو سند صحیح سے ثابت ہو کر بلا کم و کاست ہم تک پہنچی ہیں اور جبکہ تشبہ کی یہ تنگی یا سخت گیری کسی عالم کی اختراع نہیں تو پھر سوچو کہ یہ تنگ خیالی اور تنگ نظری کا الزام کس پر عائد کر رہے ہو؟ علمار پر یا احادیث کے ذخیرہ پر یا اس ذخیرہ کے بخدوم خاص پر؟

مرا بہ رندی و عشق آں فضول عیب کند	کہ اعتراض بر اسرار علمار غیب کند

پھر جبکہ تشبہ کی منقولہ آثار و روایات عقلی و حسی یا طبیعی قانون پر بھی منطبق ہوتی ہیں جیسا کہ ثابت کر دیا گیا تو کیا وجہ ہے کہ یہ الزام خود ان نکتہ چینیوں پر بھی عائد ہو جبکہ اس عقل و طبیعت اور نیچر کی پیروی کا ادعا انھیں سب سے زیادہ بے چین رکھتا اور ایسے ایسے لایعنی وساوس اُبھارتا رہتا ہے۔ بس یہ تنگ خیالی کا الزام اگر دیدہ و دانستہ ہے اگر کسی عالم پر ہے اور اگر عام روشن عقل و طبع پر ہے تو یقیناً

نکتہ چینیوں پر بھی ہے اور اسلئے اس الزام کی جوابدہی تنہا ہمیں پر کیوں عائد کیجا رہی ہے؟ -

	لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق	

حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے ہی دائرہ میں رہکر گفتگو کرنی چاہئے اور اسی فن میں محدود رہکر بولنا چاہئے جس کا وہ اہل بنایا گیا ہے -

	میل او را در دلش انداختند		ہر کسے را بہر کارے ساختند

مسئلہ تشبہ نہ تو کوئی سیاسی واقتصادی مسئلہ ہے اور نہ موجودہ پالیٹکس سے اُسے کوئی تعلق ہے بلکہ وہ شریعت کا ایک سچا اور صاف مسئلہ ہے جو سیاستِ نبوۃ سے وجود پذیر ہوا ہے اسلئے اس کی تحقیق بھی اسمبلی کے رائے دہندوں اور کالجوں کے موسسین یا پروفیسروں کے بجائے صرف دائرہ شریعت کے ارکان اُن علماء ہی سے کرنی چاہئے جنہوں نے اپنی عمریں قرآن و سنت کے ذکر و فکر میں گذاریں اور آیات و احادیث کو اپنے اپنے محل پر جمع کرنے کی واقعی اہلیت اپنے اندر پیدا کی تعجب ہے کہ حدیث کا رُھبانیۃ سے کس طرح تشبہ کا مسئلہ باطل ٹھیرایا جارہا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث تو اپنے الفاظ و نظم اور معانی و حقائق کے اعتبار سے تشبہ کے مسئلہ کو نہ صرف نمایاں ہی کر رہی ہے بلکہ اس کے اثبات کی ایک نہایت ہی قوی اور محکم دلیل ہے۔ ہم بے حد مشکور ہیں اُن کے جنہوں نے مسئلہ تشبہ پر اس حدیث سے اعتراض کر کے ہمیں اس مسئلہ کے ثابت کرنے میں مدد دی اور ایک مستقل دلیل کی طرف ہماری توجہ کو پھیر دیا۔

حدیث مذکور کی غرض تو آپ کے نزدیک بھی یہی ہے کہ دین میں حد سے گذرا ہوا تشدد اور زوائد کا تعمق نہیں ہے۔ لیکن اسپر غور کرو کہ حدیث کے حکمت آمیز نظم نے یہاں دینی غلو اور مذہبی تشدد کو ان صاف اور صریح الفاظ میں تو نہ روکا کہ "لوگو! دین میں تشدد مت کرو" بلکہ تشدد کی نفی کی تو ان الفاظ میں کی کہ لا رُھبانیۃ فی الاسلام (لوگو اسلام میں رہبانیہ نہیں ہے)۔ حالانکہ اس مقصد کو جتلانے کیلئے پہلا جملہ زیادہ صاف و صریح تھا۔ پھر ایسا کیوں کیا گیا؟ اسلئے کہ مذہبی تشدد کی ممانعت کے ساتھ ساتھ یہاں اسکے بُرائی کی حقیقی علّت پر بھی متنبہ کرنا منظور تھا کہ وہ صرف

تشبّہ ہے۔ اور وہ اسطرح کہ رہبانیۃ منسوب ہے راہب کیطرف اور راہب نصاریٰ کے درویش
اور عابد کو کہتے ہیں تو رہبانیۃ کے معنی ہوئے راہب کا فعل کرنا۔ راہب بننا۔ پس حضور نے یوں
نہ فرمایا کہ اسلام میں تشدد جائز نہیں" بلکہ یوں فرمایا کہ اسلام میں راہبوں کے سے کام کرنا
راہب بننا جائز نہیں اور ظاہر ہے کہ راہبوں کے سے اعمال کرنا ہی تو ان کے ساتھ تشبّہ و مشابہت
پیدا کرنا ہی۔ پس بالفاظ دیگر حدیث کا حاصل یہ ہوگیا کہ اسلام میں راہبوں کے ساتھ تشبّہ کرنا
جائز نہیں۔ اور معلوم ہے کہ نصاریٰ میں رُہبان کی جماعت سب سے زیادہ مقدس اور برگزیدہ [illegible]
ہے جبکہ اُسی سے تشبّہ ناجائز ہوگیا تو اس قوم کے عوام سے تشبّہ اور مشابہت کیونکر جائز ٹھیرے گی؟
لہٰذا حدیث کے بیان کردہ حکم اور اُسکی علّۃ کا حاصل یہ نکل آیا کہ اسلام میں تشدد جائز نہیں
کیونکہ تعمق و تشدد کرنے سے مسلمان لامحالہ اہل کتاب کے احبار و رہبان کے ساتھ [illegible]
میں مشابہ ہو جائیں گے۔ اور ان کیسے سلاسل و اغلال میں اپنی گردنیں پھانس بیٹھیں گے۔ اور مشابہت
طبعاً و شرعاً ممنوع ہے اسلئے یہ غلو اور تعمق بھی ممنوع ہے۔

پس حدیث میں پہلے تشدد کی ممانعت بتلائی اور پھر اس بُرائی کی علّۃ جو محض تشبّہ ہے، صریح
الفاظ میں اس طرح ظاہر کردی گئی کہ نہ صرف تشبّہ بالرُہبان بلکہ پھر اس تشدد کی نوعیت بالخصوص [illegible]
ناجائز اور ممنوع ٹھیر گیا۔[۵]

پس ہنگامی حریّۃ کے علمبردار۔ اور آزادی کے جوش میں دین و مذہب کو بھی [illegible]
خواہشمند اس حدیث سے مسئلہ تشبّہ کے خلاف جو کچھ ثابت کرنا چاہتے تھے وہ تو ثابت نہ ہوا
جو ثابت ہُوا وہ اس مسئلہ کے خلاف نہیں بلکہ اور اس کی جڑوں کو مضبوط کر رہا ہے۔

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

پس جس طرح یہ نکتہ چین حدیث مَنْ تَشَبَّہ پر نقض وارد کرنے میں ناکام رہے تھے [illegible] حدیث
لَا رُهْبَانِيَّة سے معارضہ پیش کرنے میں بھی خدا نے انہیں ناکام کر دیا۔ اور مسئلہ ترک تشبّہ [illegible]

[۵] رأیت ہٰذا الجواب فی بعض کتب سیدی و مولائی [illegible] حضرت [illegible] تھانوی [illegible]

پر غبار ہوگیا نہ اوس پر معاندوں کے شبہات پڑ سکے اور نہ خود بذاتہ اوس کا کوئی پہلو کمزور رہا۔ اور یہی شرعی حکم کی یہی شان ہی ہوتی ہے کہ وہ کسی آن قابل رد نہیں ٹہر سکتا لیکن اوسکو رد کرنیوالے خود ہی مردود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ہذہ الردة الطامة ووفقنا لما یحبہ ویرضی۔

فصل

اختتام بحث اور اتمام حجۃ

مسئلہ تشبّہ کا سب سے تحتانی سنگِ بنیاد

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(۱۰)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

منکرین کے تمام اعذار بارِدہ کا فیصلہ کن جواب

مسئلہ تشبّہ کی تمام عقلی و نقلی بحثیں معلوم کر لینے اور مسئلہ امر و نہی کے سارے فیصلے سُن لینے کے بعد اگر حقیقت الامر پوچھتے ہو تو مسئلہ زیر بحث کی عمارت کا سب سے نیچے کا سنگ بنیاد قلب سلیم کا ایک صحیح اور صادق جذبہ ہے جسکو عشق و محبت کہتے ہیں۔

یہی وہ موثر اور محیر العقول جذبہ ہے کہ جہاں دنیا کے تمام دساتیر و قوانین۔ تمام اخلاقی اور عقلی قوتیں بے شمار منافع کی طماعیاں اور انتہا مصائب کی تخویفیں بھی قلوب پر اپنا کوئی اثر نہیں دکھا سکتیں وہاں عشق و محبت کی غیر محسوس قوت نہایت سہولت سے اپنا کام کر گذرتی ہے۔

عقل گوید شش جہت راہیست حد کہ بیش نیست
عشق گوید ہست راہے بارہا من رفتہ ام

جب کسی دل میں عشق و محبت کے جذبات سرایت کرتے ہیں تو سب سے پہلی کیفیت عاشق پر یہ طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ کا تمام سرمایہ یعنی جذبات، اوقات اور [illegible] و [illegible] تک کو محبت اور محبوب کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے۔ پھر اس کا اپنا کوئی ارادہ باقی رہتا اور نہ خواہش۔ وہ آزاد عاشق ہونے کے بجائے غلام محض بن جاتا اور خود رائی یا اپنی تجویز کو مٹا دیتا ہے۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست	کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(۲) پھر عاشق کے تمام وہ جذبات و مرضیات جو سلطان عشق نے چھین لیئے تھے سب کے سب محبوب کے عزائم و مرضیات میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ عاشق کے قلب و دماغ یعنی عزائم و افکار پر محبوب چھا جاتا اور عاشق کے کل افعال خود اسکی مرضی سے ظہور پذیر ہونے کے بجائے محبوب کی مرضی سے سر زد ہونے لگتے ہیں۔ اور اسکی زندگی و موت سب محبوب کے لئے ہو جاتی ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو	دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(۳) پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس انہماک محبت اور استغراق عشق میں عاشق کو ایک محبوب ہی محبوب نہیں رہتا بلکہ اسکی ہر ایک آن وبان اور ساری ادائیں حتیٰ کہ اسکے تمام متعلقات و منسوبات یہانتک کہ اس کے کوچہ کی درو دیوار تک محبوب اور جاذب دل بنجاتی ہیں۔

أمرّ علی الدیارِ دیارِ لیلیٰ	أُقبّلُ ذا الجدارَ وذا الجدارَ
وَمَا حبُّ الدیارِ شغفنَ قلبی	ولکن حبُّ مَن سکنَ الدیارَ

(۴) پھر یہ بھی وہ محبت صادقہ ہے کہ جس کے رسوخ و استحکام کے بعد دنیا کی کوئی طاقت عاشق کو تمام راہ عشق سے جنبش نہیں لا سکتی یعنی نہ اس کے جذبات محبت میں کسی ناصح کی نصیحت سے کمی آسکتی ہے اور نہ کسی لائم کی ملامت سے کوئی تذبذب۔ بلکہ یہ نصیحت و ملامت اور زیادہ اسکے عشق کو بھڑکا دیتی اور وہ بہت اس وارفتگی اور بے ساختگی کا زیادہ سے زیادہ طلبگار ہو جاتا ہے۔

مصلحت نیست مرا سیری ازان آب حیات	ضاعف اللہ بہ کل زمانٍ عطشی

عاشق کی یہ خود گذاری یا ترک خودی اسکی تفویض و تسلیم پھر ترک ماسوی یا غیر محبوب سے استغنا اس مادی عشق و محبت کے افسانے ہیں جسمیں نہ دوام ہے نہ استقلال نہ بقا ہے نہ قرار۔ محب بھی چند روزہ ہے اور محبوب بھی عارضی۔ محب کا عشق بھی زائل ہے اور محبوب کا جمال بھی فانی تو پھر ہی بتلاؤ کہ اگر کسی کا دل ایسے

۵ مجنوں کہتا ہے کہ میں لیلیٰ کے کوچہ پر گذرتا ہوں تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو اور میرے دل میں اصل کوچہ کی درو دیوار نے کوئی گھر نہیں بنایا بلکہ اس کوچہ کی رہنے والی نے (اسکی وجہ سے یہ متعلقات بھی دل میں رہ گئے۔ ۱۲

آیت کریمہ میں مطیعوں اور عاشقوں کو وصف ایمان کے ساتھ مؤمن اور مؤمنۃ ذکر فرماکر سلب اختیار اور سلب آزادی کو اُس پر متفرع کرنے سے یہی ظاہر کرنا منظور ہی کہ ایمان عشق حق کا نام ہی اور عشق میں عاشق کی آزادی باقی رہنی قدرتی طور پر ناممکن ہی اور پھر اسی آیت میں خود رائی کو عصیان سے تعبیر فرماکر یہ ظاہر کیا گیا ہی کہ حکم الٰہی آجانے کے بعد اپنی تجویز کا دخل دینا ایمان کی کمزوری اور عشق کی خامی کی دلیل ہی۔

تفویض و تسلیم پھر دوسری وہ کیفیت جس کو ترک خودی کے بعد عاشق محسوس کرتا ہی یہ ہے کہ مؤمن کے یہ تمام سلب شدہ اختیارات و مرضیات محبوب حقیقی کی مرضیات و اختیارات میں فنا اور مضمحل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسپر بجائے اُس کے نفس کے حق ہی حق چھا جاتا ہی وہ کرتا ہے تو اُس کے لئے اور رکتا ہی تو اُسکے لئے جیتا ہی تو اُس کے لئے اور مرتا ہے تو اُس کیلئے اُس کی عادات بھی اسی کے لئے ہو جاتی ہیں اور عبادات بھی اُسی کیلئے۔ غرض تفویض مطلق اور تسلیم محض اُس کا امتیازی شعار بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام جان سپاری ہی جسکو شریعت اپنی اصطلاح میں اسلام کہتی ہی۔ حضرت حق نے ابراہیم علیہ السلام سے اسی اسلام و استسلام کو اَسْلِمْ کہکر طلب کیا اور پھر اُن سے اسی عنوان کی حقیقت کا یہ کہکر ایک عملی اقرار لیا تھا کہ۔

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذلک أمرت وانا اول المسلمین ۔	(اے ابراہیم) کہدو کہ میری نماز اور میرا حج اور میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا امر کیا گیا ہی اور میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

پھر اسی مقام کو اللہ نے اپنے آخری نبی کی زبان پر ان الفاظ میں ظاہر فرمایا کہ۔

من اعطی للہ ومنع للہ واحب للہ وابغض للہ فقد استکمل الایمان (مشکوۃ)۔	جس نے اللہ ہی کیلئے دیا اور اسی کیلئے روکا اسی کیلئے محبت کی اور اسی کیلئے عداوت باندھی تو بلاشبہ اُس نے ایمان کامل کرلیا۔

یہی وہ مقام ہی جسکی استدعا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان دعائیہ کلمات میں فرمائی ہی کہ۔

اللّٰہمّ احفظنی بالاسلام قائما واحفظنی بالاسلام قاعدا واحفظنی بالاسلام راقدا ۔	اے اللہ میری حفاظت اسلام سے فرما، کھڑے اور بیٹھے اور سوتے ہوئے۔

کہیں اسی درجہ کو حضور نے ان الفاظ میں ادا کیا ہی کہ۔

اللھم خذ الی الخیر بناصیتی واجعل الاسلام منتھی رضائی۔	اے اللہ میری پیشانی کو خیر کی طرف کھینچ لے اور میری انتہائی رضا سے انتہائی تمنا و خوشی میں اسلام کو فرما دے۔

غرض اس مقام اسلام و استسلام کا حاصل حضرت عارف شیرازی کی لسان میں یہ ہے کہ۔

زبادشاہ وگدا فارغم بحمد اللہ	گدائے خاک در دوست بادشاہ من است
غرض ز مسجد و میخانہ ام وصال شما است	جز این خیال ندارم خدا گواہ من است

الحاصل قصر محبت کے لئے یہی دو مقام بمنزلہ عمود اور ستون کے ہیں ایک ترک ماسوی جو اس درجہ پر ہو کہ خود اپنے نفس کو بھی ماسوی سمجھ کر ترک کر دیا جائے اور ایک انہماک عشق یا محبوب میں استغراق کہ ہر کیفیت میں اسی کا جلوہ جہان فروز نظر آئے اور وہی وہ ہو دوسرا نہو۔

شغف ترک پہلی کیفیت یعنی ترک ماسوی میں جب عاشق کو شغف پیدا ہوتا ہے تو قلب سے ہر ماسوی اور ہر ایک غیر حق محو ہونے لگتا ہے یعنی طبعی طور پر ایمانی قلب میں ہر وہ چیز مستنکر اور قبیح محسوس ہونے لگتی ہے جس میں حق کا کوئی لگاؤ اور محبوب حقیقی کے ساتھ کوئی نسبت نہو۔ پس غیر حق خواہ وہ غیر حقانی اشخاص ہوں یا غیر حقانی اعمال۔ غیر حقانی علوم و افکار ہوں یا غیر حقانی شعائر و امتیازات۔ غیر حقانی روشیں ہوں یا غیر حقانی صورتیں اور سیرتیں اور بالجملہ تمام وہ امور جو اغیار سے نسبت رکھتے ہوں ایک سچا دلدادۂ قلب ان کی نسبت والفت کے ساتھ نہیں جم سکتیں۔ اسی ترک ماسوی کے شغف کو بڑھانے پر محبوب حقیقی (حق تعالیٰ) کے یہ اوامر وخطابات مبنی ہیں کہ۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔	اور ان ظالموں کی طرف مت جھکو ورنہ تم کو (دوزخ کی) آگ لگ جائے گی۔

اغیار میں سب سے بڑا غیر شیطان اور اس کی ذریت ہے تو فرمایا۔

افتتخذونہ وذریتہ اولیاء من دونی وھم لکم عدو بئس للظالمین بدلا۔	[illegible]

اسی ترک ماسوی کے شغف پر علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب [illegible] میں [illegible] روایت [illegible] نقل کی ہے کہ۔

اوحی اللہ الی نبی من الانبیاء اَن قل لقومك لایدخلوا مداخل اعدائی ولا یلبسوا ملابس اعدائی ولا یرکبوا مراکب اعدائی ولا یطعموا مطاعم اعدائی فیکونوا اعدائی کما ھم اعدائی (الزواجر ص۔۔۔ جلد اول)	خدا نے انبیاء میں سے ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم سے کہدو کہ وہ میرے دشمنوں کے گھسنے کی جگہوں سے گھسیں بھی نہیں اور میرے دشمنوں کا سا لباس بھی نہ پہنیں اور میرے دشمنوں کے کھانوں جیسے کھانے بھی نہ کھائیں اور میرے دشمنوں کی سواریوں جیسی سواریوں پر سوار بھی نہوں۔

یعنی ان میں سے ہر چیز میں کسی امتیاز کی شان پیدا کریں اور امتیاز سب سے بہتر اس طریقہ سے ہو جائیگا جو سنت نبوی ہو تاکہ کہیں وہ بھی ان دشمنوں کیطرح میرے دشمن نہ بن جائیں۔

اس وحی کے آخر کا یہ جملہ فیکونوا اعدائی کما ھم اعدائی (کہیں وہ بھی ان دشمنوں کیطرح میرے دشمن نہ بن جائیں) ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفار کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کی ممانعت فرما کر کہا تھا کہ اگر تم ان کے ساتھ بیٹھے اٹھے تو انکم اذا مثلھم (اس وقت تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے) یا قرآن کریم نے کفار کی دوستی اور موالاۃ قطع فرمانے کا حکم دیکر کہا ہے کہ ومن یتولھم منکم فانہ منھم (اور جو تم میں سے ان کی دوستی کریگا تو وہ انہیں میں سے شمار ہوگا) یا حدیث نبوی نے مشابہت کفار سے روک کر فرمایا کہ من تشبہ بقوم فھو منھم (جو کسی قوم کیساتھ مشابہت اختیار کریگا تو وہ اسی قوم میں سے ہو جائیگا)۔

شفقت تحبب اور ہر یہ دوسری کیفیت تھی کہ انہماک عشق اور استغراق فی المحبوب میں شفقت پیدا ہوتا ہے تو پھر ایک ذات محبوب ہی محبوب نہیں رہتی بلکہ محبوب کے اوصاف اسکے احوال اسکے افعال حتی کہ اسکے تمام منسوبات بھی اسکی خاطر سے دل میں محبوب ٹھہر جاتے ہیں پس اسی طرح حضرت حق تعالیٰ اور بارگاہ نبوۃ کی محبت ایمانی قلب میں جاگزیں ہوتی ہے تو اسکے ہر اس چیز کی الفت بھی جم جاتی ہے جو حق سے کوئی نسبت رکھتی ہو۔ خواہ وہ حقانی اشخاص ہوں یا حقانی اعمال حقانی علوم ہوں یا حقانی شعائر، حقانی اوضاع واطوار ہوں یا حقانی رسوم وحقائق۔

اسی شفقت تحبب کے مقام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعا میں مانگا ہے کہ۔

اللھم انی اسئلك حبك وحب من یحبك	اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری محبت اور اس

والعمل الذی یبلغنی حبک اللّٰھم اجعل حبک احب الیّ من نفسی واھلی ومن الماء البارد۔

شخص کی محبت کا جو تجھ سے محبت رکھتا ہو اور اس عمل کی محبت کا جو تجھ تک پہونچاتا ہو اے اللہ اپنی محبت کو میرے دل میں میرے نفس سے بھی زیادہ میرے اہل وعیال سے بھی زیادہ اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب بنا دے۔

مثلاً ایمان وصال حق کا ذریعہ ہے اسلئے حضور نے اسکی محبت کا بھی سوال فرمایا کہ۔

اللّٰھم حبب الینا الایمان وزینہ فی قلوبنا۔

اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈالدے اور اسی سے دلوں میں آراستہ فرما دے۔

یا مثلاً موت وصال حق کیلئے رہگذر ہے اسلئے آپ نے اسکی محبت کا بھی سوال فرمایا کہ۔

اللّٰھم حبب الموت الی من یعلم انی رسولک۔

اے اللہ موت کی محبت ہر اس شخص کے دل میں ڈالدے جو مجھے رسول جانتا ہو۔

محبت کے انہی دو مقاموں (اخذ وترک) کے شغف سے [illegible] پیدا ہوتا ہے یعنی شغف محبت سے تو تشبہ بالصلحاء کی بنیاد پڑتی ہے اور شغف ترک ماسویٰ سے ترک تشبہ بالکفار کی یعنی جس درجہ محبت حق میں شغف بڑھتا جائیگا اسی درجہ ان کی اوضاع واطوار اور انکی ہر ہر روش کی محبت اور توجہ استعمال بھی ترقی کرتی جائیگی اور پھر باندازۂ محبت جس درجہ ترک ماسویٰ میں شغف ہوتا جائیگا اسی درجہ اغیار کی ہر ہر روش سے نفرت وعداوت اور توجہ انقطاع بھی بڑھتی جائیگی۔

پس اغیار کتنا ہی اپنی روشوں اور اوضاع واطوار کو مزین اور دلفریب بنا کر پیش کریں لیکن یہ حقیقت کا عاشق (مومن) ان صورتوں پر مائل نہیں ہو سکتا۔ خواہ نفس وشیطان اور شیاطین الانس نصیحت کا پیرایہ اختیار کریں یا ملامت کا۔ ہاں اگر کسی کا عشق ہی خام ہے اور وہ خود پرستی کے نام سے خود پرستی کا بیمار ہی ہو تو پھر غیر اور غیر کی ہر روش محبوب کی اداؤں پر غالب آسکتی ہے۔

بہرحال جبکہ عشق الٰہی یا ایمان حقیقی کے ان دو مقامات کو [illegible] ترک تشبہ بالکفار کی [illegible]

[illegible]

بلاکسی امر و نہی اور بلاکسی حجت و برہان کے قدرتی طور پر کسی مومن کو حق نہیں رہتا کہ وہ کوئی عادۃ و عبادۃ یا روش و معاشرۃ محض اپنے ہوائے نفس یا تقلید اغیار سے تجویز کرے اور اپنے ایمان یا عشق کو ہر وہم سے پاک بھی سمجھتا رہے۔ کیونکہ ترک تجویز یا ترک خودی و خود رائی اور غیر سے نظر ہٹا لینا عشق کی پہلی منزل تھی اور جب پہلے ہی قدم پر اس ناکام عشق کے قدم رُک گئے تو اُسے اس لقب کو اختیار کرنے ہی کا کیا حق رہ گیا۔

پس اب ہندوستان کے فرنگیت مآب اور دلدادگان تفریح عشق الٰہی کے اس معیار کو پیش نظر رکھ کر اپنی حالت پر ایک نظر انصاف ڈالیں کہ آیا یورپ کی اس کورانہ تقلید میں اُن کے پاس کوئی حجت و عذر موجود ہے؟ یا وہ محض [illegible] کے اصول پر چل رہے ہیں۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ اگر وہ اسلامی اصولوں کے بالمقابل فرنگی نمونوں کی کوئی حجت و عظمت معاذ اللہ اپنے قلوب میں رکھتے ہیں تو انھیں اسوقت تک دعوائے ایمان ہی چھوڑ دینا چاہیے جب تک وہ اس حالت کو تبدیل کر کے تجدید ایمان نہ کرلیں، کیونکہ ایک دل میں حق کی امانت اور غیر حق کی محبت جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ | اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

اور اگر محبت نہیں بلکہ محض ایک طبعی شوق کے ذریعہ وہ نصرانی اوضاع و اطوار کے شکار ہو گئے ہیں جس میں نہ استحسان کا کوئی دخل ہے نہ استہجان کا تو پھر انہیں اس پر غور کرلینا چاہیے کہ یہی طبعی شوق ایک تجویز اور خود رائی ہے حالانکہ انھیں مومن ہونے کی حیثیت سے بندہ تسلیم و رضا بنایا گیا تھا نہ کہ پابند شوق و ہوا کہ ان کا ہر ایک فعل انکی خواہش کے تابع ہو۔ اور اگر انھیں ذاتی طور پر اس غیر حقانی معاشرۃ کا کوئی شوق بھی نہیں بلکہ محض سوسائٹی کی ملامت یا تحقیر کے خیال سے غیر اقوام کی روشوں پر جھک پڑے ہیں تو پھر انھیں یقین کر لینا چاہیے کہ اُن میں عشق الٰہی و محبت نبوی کا کوئی بھی اثر ابھی تک راسخ نہیں ہوا۔ ورنہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ عاشق سچا عاشق بھی ہو اور کسی لائم کی ملامت یا ناصح نادان کی نصیحت سے متاثر ہو کر محبوب کی روش پر خاک بھی ڈالدے؟ ہرگز نہیں۔

یہ سُنّت تو ابو طالب کی ہے کہ جنہوں نے دین اسلام کو حق سمجھتے ہوئے بھی ملامت کے خیال سے مرتے دم تک قبول نہ کیا اور حضورؐ کی دعوت اسلام پر دم واپسیں [illegible]۔

اظهرت دینا قد علمت بانه	من خیر ادیان البریة دینا
لولا الملامة او حذار مسبة	لوجدتنی سمحا بذاک مبینا

پھر کون ہے کہ ابوطالب کو مومن صادق یا عاشق حقیقت کہنے کی جرأت کرے۔ ہاں عشاق حقیقت کی سنت یہ ہے کہ وہ محبوب کے حقیقی معاملہ میں کسی طعن وتحقیر کی نیم جو کی برابر بھی پرواہ نہیں رکھتے اور ایسی ملامتوں کو نوک پاپوش سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ حضرت حذیفہ ابن یمان کے ہاتھ سے کھانا کھاتے ہوئے لقمہ گر پڑا تو انھوں نے اٹھا کر صاف کیا اور مونھ میں رکھ لیا، ایک خادم نے عرض کیا کہ ایسا نہ کیجئے عجمیوں میں یہ طریقہ معیوب ہے اور وہ ایسے شخص کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تو برہم ہو کر فرمایا۔

أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحَمْقَاءِ ۔ کیا میں اپنے محبوب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے چھوڑ دوں گا؟

پس اہل ہوا کے طعن وتحقیر سے کسی سچائی اور پاکبازی کو چھوڑ دینا تو ابوطالب کا شیوہ ہوا اور ساری دنیا کی ملامتوں کے جھرمٹ میں حق کے سامنے گردن ڈالدینا حضرت حذیفہ کی، اور ظاہر ہو گیا کہ ایمان کس کے لئے حضرت حذیفہ کا اسوہ تو قابل تقلید ہو سکتا ہے لیکن ابوطالب کا نقش قدم کسی طرح نشان راہ نہیں بن سکتا۔

اور اگر وہ اسلئے تشبہ بالنصاریٰ پر رضامند اور قناعت پذیر ہیں کہ انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی باجبروت اور حکمران قوم سے تشبہ کیا ہے، تو انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ نبوۃ سے بڑھکر عالم میں کوئی حکمرانی اور بادشاہت نہیں۔ یہ آسمانی بادشاہت جب ظہور کرتی ہے تو تمام زمینی حکمرانیاں اسکے سامنے سربسجود ہو جاتی ہیں۔ یہ سلطنت جب چودہ صدی پیشتر پھٹے پرانے کپڑوں شکستہ حجروں اور ظاہری بے سروسامانیوں کے ساتھ عالم میں ظاہر ہوئی تو اسکے ایک اشارہ نے دنیا کی حکمرانیوں کے نقشے بدل دیئے۔ فارس کا زبردست تخت قیصر کا چھتا ہوا اقتدار وہ [illegible] ان طاقتوں کو زیروزبر کر دیا جو آراستہ سامانوں، رنگا رنگ قوتوں اور منظم فوجوں کے [illegible]

گدا بہ تخت نشانند و بادشہ گیرند	تجو بہ محل شاہی کہ در ولایت عشق

پس کیا ایک نبوت کی بارگاہ کا عاشق اور مدعیٔ محبت بھی کسی سلطنت کی چوکھٹ پر سر ٹیک سکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ تو غیر کی طرف پورا التفات ہے حالانکہ ولایت عشق کا پہلا قانون تو غیر کے خیال کو بھی دل سے محو کر دینا ہے، چہ جائیکہ غیر پر اوندھا ہو جانا۔

اور اگر وہ اسلئے غیر اقوام کی ہو بہو پیروی کر رہے ہیں کہ ان کے معمولات و مصنوعات میں کچھ مادی منفعتیں اور معاشرتی راحتیں بھی انھیں نظر آ رہی ہیں اور ظاہری زینتیں بھی، تو انھیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ چیز جو کسی منفعت پر مشتمل ہے ضروری نہیں ہے کہ مباح بھی ہو، شراب اور قمار بازی میں بھی منفعتیں ہیں اور وہ کہ جن کا قرآن کو بھی اقرار ہے پھر عموماً عالم کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو محض مضر ہو اور کسی منفعت پر بھی مشتمل نہو۔ لیکن پھر بھی ان دونوں چیزوں اور دوسری بہت سی اشیاء کو قرآن نے حرام قرار دیا اور اسلئے قرار دیا کہ انکی مضرتیں اور بالخصوص روحانی مضرتیں انکے منافع پر غالب تھیں پس مطلقاً منفعت کسی شے کیلئے موجب استعمال نہیں بن سکتی۔ رہی زینت تو اول تو عاشق کو زینت اور بناوٹ سے کیا سروکار، اسے بناؤ سنگار اور فیشن کی غلامی سے کیا واسطہ؟ اور اسکو خرقہائے اختراع و ثیاب نو سے کیا علاقہ ع

	اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد	

عاشق کو تو جامہ دوزی کے بجائے جامہ سوزی ملی ہے۔

شمع زمن گل من آموخت	پروانہ زمن	افروختن و سوختن و جامہ دریدن

اور اگر اسے تجمل ہی محبوب ہے تو پھر عشق کے ہوتے ہوئے محبوب ہی کا تجمل محبوب ہو سکتا ہے نہ کہ اغیار کا بلکہ اعداء کا۔

بہر حال دعوائے عشق اور ادعائے ایمان رکھتے ہوئے یہ تمام اعذار باردہ محض لچر اور حیلہ جوئی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ زمانہ کو دجل و فساد نے گھیر لیا، قلوب منحرف ہو گئے ایمان اور ایمانی اشیاء سے منافرت اور اطوار مسلمین سے اجنبیت دلوں میں بیٹھ گئی۔ اس لئے سبیل المؤمنین پر چلنے کی توفیق بھی چھن گئی یہ مختلف اعذار اور حیلے محض اسلئے ہیں کہ اس بے توفیقی کے عیب پر پردہ ڈال دیا جائے۔ ورنہ اگر

دلوں میں محبوب حقیقی کی لو لگی ہو تو کسی حیلہ کی پیش چلے اور نہ کسی رہنما کی حاجت رہے تو سب خود بخود رہنمائی کرنے لگیں اور اس قسم کے غلط اور بے وزن اعذار کو محو کر ڈالیں۔

شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست

ہاں جب کسل و غفلات اور قلت مبالاۃ کے غلبہ سے راہ عمل پر گامزنی ہی مقصود نہ ہو تو ہزار [illegible]

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

اللّٰہم انا نعوذ بک من القسوۃ والغفلۃ والعیلۃ والذلۃ والمسکنۃ

تم المجلد الاول (والحمد للہ) ویلیہ المجلد الثانی

(ان شاء اللہ)

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کی بعض قابل دید تصنیفات

نام کتاب مع مختصر تعریف	قیمت
تقریر دلپذیر حضرت قاسم العلوم والخیرات کی وہ	
عجیب وغریب تصنیف کہ جس میں دین اسلام کے اصول کی	
حقانیت عقلی طور سے ثابت کی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ دنیا	
میں نجات دہندہ اگر کوئی دین ہے تو وہ صرف اسلام ہے	
مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی تھی اس مرتبہ نہایت اہتمام کیساتھ	
مطبع قاسمی دیوبند سے مع اضافہ عنوانات فہرست مضامین چھپا ہے	عہ
حجۃ الاسلام حضرت قاسم العلوم والخیرات کے	
تصنیف کا نمونہ اثبات توحید و رسالت کے متعلق مضامین نہایت	
معقول ثابت ایک مقدمہ دیباچہ حضرت شیخ الہند رح مطبوعہ جدید	۸؍
قبلہ نما انتصار الاسلام کا دوسرا حصہ استقبال قبلہ اور	
بت پرستی کا باہمی فرق اور حقیقت استقبال قبلہ کی بیان	
اور آریوں کے اعتراضات کو رد کیا ہے۔ قابل دید رسالہ	۸؍
تحفہ لحمیہ جس میں گوشت خوری انسان کا طبعی و	
فطرتی خاصہ ثابت کیا گیا ہے از حضرت قاسم العلوم والخیرات	۱؍
تصفیۃ العقائد جس میں وہ دلچسپ مراسلات	
درج ہیں کہ جو مابین حضرت مولانا و سرسید بہادر بانی علیگڈھ	
کالج ... اسلام و اصول شریعت کے بارہ میں ہوئی تھیں	
... تمام مختلف فیہ مسائل کا انصافاً مختصر پیرایہ	
میں فیصلہ کر دیا ہے۔ قابل دید رسالہ ہے کاغذ سپید ولایتی عمدہ	۳؍
جواب ترکی بترکی آریہ سماج کے ان اعتراضات	
کا جواب ہے جو آریوں نے میرٹھ میں کئے تھے قابل دید رسالہ	۴؍
انتصار الاسلام پنڈت دیانند سرستی کے دس	
اعتراضات کا جواب جو کہ اوس نے مقام رڑکی مجمع عام میں کئے تھے	۲؍
الدلیل المحکم جس میں عدم قراءت فاتحہ خلف الامام	
مطابق مذہب حنفیہ ثابت فرمایا ہے۔ قابل قدر رسالہ	۱؍
ادلہ کاملہ اہل حدیث کے دس اعتراضات کا	
عالمانہ جواب اور اپنی طرف سے گیارہ لاجواب سوال قیمت	۲؍
تحذیر الناس اس رسالہ میں ولکن رسول	
اللہ وخاتم النبیین کی عجیب وغریب تفسیر ہے اور عجیب	
عجیب مسائل کا بیان ہے۔ قابل دید کتاب، قیمت	۳؍
آب حیات اس کتاب میں جناب رسول مقبول صلی اللہ	
علیہ وسلم کی حیات جسمانی و روحانی کے ضمن میں تمہید و مقدمات	
عجائب و تحقیقات مسائل عقلیہ و نقلیہ بیان فرمائے ہیں،	عصہ
اسرار قرآنی (فارسی) اس میں چند آیات کے نکات	
و تفاسیر اور بعض خطوط حضرت مولانا کے درج ہیں قیمت	۱؍
مناظرہ عجیبہ تحذیر الناس پر بعض علماء نے تحریری	
اعتراضات کئے تھے ان کا جواب نہایت دقیق عالمانہ	۷؍
مباحثہ شاہجہانپور حصہ دوم گفتگوئے مذہبی	
سنہ ۱۲۹۳ھ کے مباحثہ میں جب مذاہب باطلہ نے منہ کی کھائی	
دوبارہ سنہ ۱۲۹۵ھ میں پنڈت دیانند وغیرہ نے مناظرہ کی ٹھانی اور منہ کی کھائی	۷؍

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ ہر قسم کے قرآن شریف مترجم اور ہر قسم کی کتابیں عربی و فارسی و اردو، درسی و غیر درسی بکفایت ملنے کا

پتہ: منیجر کتبخانہ مطبع قاسمی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)